مؤمنین اہلِ سُنّت کو اِسلامی سالِ نو مُبارک!

ماہنامہ
نقیبِ ختمِ نبوّت
مُلتان

ذِلّت کی زندگی سے عزّت کی موت بہتر ہے

ارشاد سیّدنا حضرۃ حُسین رضی اللہ عنہ

ابنِ زیاد — کے ہاتھ پر — یزید کی بیعت —؟ تو خُدا کی قسم! یہ بات میری موت کے بعد ہی ممکن ہے!

ہاں! اگر باعزّت طریقہ سے مُعاملہ فہمی مقصود ہے تو پھر مدینہ کو واپسی یا سرحد پر چلے جانے کے علاوہ تیسری صورت یہ ہے

مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں پھر وہ میرے متعلق جو مناسب سمجھے گا خود فیصلہ کرے گا — [البدایہ - لابن کثیر - ص۱۷۰ ج۸]

.... اور یا میں اپنا ہاتھ یزید بن مُعاویہ کے ہاتھ میں رکھ دوں تو وہ میرے اور اپنے بارہ میں جو مناسب ہو وہ رائے قائم کرے گا — [تاریخ الامم والملوک - للطبری - ص۲۳۵ ج۶]

سیّدنا امام حُسین سے پختہ روایت ہے، آپ نے کمانڈر کوفہ عمر بن سعد سے فرمایا —

میری تین باتوں میں سے ایک پسند کرلو (۱) یا میں اُس جگہ لَوٹ جاتا ہوں، جہاں سے آیا ہوں (۲) یا یہ کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ پر رکھ دوں. جبکہ وہ میرے چچا کا بیٹا ہے تو وہ میرے متعلق اپنی رائے خود قائم کرے گا - (۳) اور یا پھر مجھے مسلمانوں کی سرحدات میں سے کسی سرحد کی طرف روانہ کر دو تو میں وہیں کا باشندہ بن جاؤں گا۔ پھر جو نفع اور آرام وہاں کے لوگوں کو حاصل ہوگا وہی مجھے بھی مِل جائے گا اور جو نقصان اور تکلیف وہاں کے لوگوں کو ہوگی وہی مجھے پہنچے گی —

[اہلِ وعظیم ترین کتاب شیعیانِ علی — الشافی - مع - التلخیص ص۱۷۱ ج۴ طبع ایران —! تصنیف السیدابی القاسم علی بن الحسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراھیم بن موسیٰ بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن زین العابدین علی الاوسط بن السبط الامام سیّدنا الحسین بن الامام سیدنا علی بن طالب — علیہم السلام]

اے کاش یہ شرائط نامہ طے ہوجاتا تو اُمّت کو مظلومیٔ حسین کا دردِ غم دیکھنا نصیب نہ ہوتا اور نہ — یزید ہی کیلئے سبّ وشتم اور لعن طعن کا دروازہ کُھلتا۔! بہرحال جناب امام شہید کا قول وعمل ہمارے لیئے ایک دائمی درسِ عبرت وغیرت ہے! خُدائے پاک ہمیں شہیدِ کربلا کی سچّی پیروی نصیب فرمائیں، — آمین —!

تحریکِ تحفّظِ ختمِ نبوّۃ [شعبۂ تبلیغ] عالمی مجلسِ احرارِ اسلام

احرار اور پاکستان

ہمارے جن ہم وطنوں کو سوائے ہوسِ زر کے اور کسی چیز کا احساس ہی نہیں، وہ غریب مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو کیا سمجھیں گے وہ خوش فہم مسلمان علماء جو پاکستان کے خلاف تبلیغِ اسلام کی دلیل پیش کرتے ہیں، وہ سماج کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور عوام کی نبض نہیں پہچان سکتے۔ جنہیں روزانہ ہندوؤں کے ہاتھوں بے عزتی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اگر پاکستان سکیم سے مسلم لیگ کا مقصد چند ایک فوائد حاصل کرنا اور ہندوؤں کو موجودہ سلوک جاری رکھنے کی اجازت دینا نہیں تو پاکستان کو ایک حقیقت کاملہ سمجھنا چاہیئے اور پاکستانی صورت کو اب صرف مسلم لیگی لیڈروں کی بزدلی یا اونچی جاتی کے ہندوؤں کے رویّہ کی تبدیلی ہی بدل سکتی ہے۔

بعض نکتہ بین مسلمان پاکستانی سکیم کو مالی اعتبار سے ناقص قرار دیتے ہیں۔ گھاٹے کے بجٹ سے حکومت چلانا ناممکن ہے۔ لیکن بڑی بڑی نوکریاں اگر ختم کر دی جائیں اور کام کرنے کا عزم دل میں موجود ہو تو دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جو اپنی حکومت کی سادہ مشین کو نہ چلا سکے۔ اگر ایک قوم کے لئے زندگی دوبھر کر دی جائے تو یہ قدرتی بات ہے کہ وہ آزادی کا سانس لینے کے لئے کسی قسم کی تکلیف کو خاطر میں نہیں لائے گی بے عزتی کی زندگی زندگی نہیں مسلمان جہنم کے پاکستان میں حکومت کرنے کو ہندوؤں کی جنّت کی غلامی پر ترجیح دیں گے۔

لیکن ہم احرار کو خالی لفاظی میں اور کانگریس اور مسلم لیگ کے بڑے بڑے نقادوں کے گفتار و کردار پر نکتہ چینی کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ مستقبل کے تفکرات نے ہمارے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت کر دی ہے اور یہ دنیا ہمارے لئے آنسوؤں کی وادی بن چکی ہے ہمارا فرض ہے کہ جرأت سے کام لے کر آگے قدم بڑھائیں اور دنیا میں یہ اعلان کر دیں کہ ہم احرار کا نصب العین مندرجہ ذیل ہے۔ :-

۱۔ ملک کی دولت کی مساویانہ تقسیم۔ ۲۔ چھوت چھات کا خاتمہ۔ ۳۔ ہر مذہب کا احترام اور شریعت کے مطابق رہنے کی مکمل آزادی

اگر ہندو قوم کسی طرح بھی ہمارے راستے میں حائل ہوئی تو اس صورت میں اور محض اسی صورت میں ہمیں مسٹر جناح کے ساتھ مل کر پاکستان کا نعرہ بلند کرنا چاہیئے۔ مسلمان اب ہندوؤں کے اقتصادی طور پر کمیرے اور سماجی لحاظ سے ان کے اچھوت رہنے کو تیار نہیں۔ ہم مسلم لیگ سے اپنے اختلاف دور کر کے ان قوتوں کے ساتھ لڑیں گے جو ہمارے زوال وادبار کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ہم آزادیٔ ہند کیلئے سرگرم پیکار رہیں لیکن ہم اس امر کا اعلان بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان اب کسی قوم یا طبقہ کے اجیر بن کر رہنے کو تیار نہیں۔

(مفکرِ احرار چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ [redacted] ماخوذ از "پاکستان اور اچھوت" صفحات ۹۲، ۹۳، ۱۴۴)

نقیبِ ختمِ نبوت ملتان

محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
اگست ۱۹۹۰ء
جلد ۱ ● شمارہ ۸

رئیس التحریر؛ ابن امیرِ شریعت سید عطاء المحسن بخاری
مدیر ——؛ سید محمد کفیل بخاری

سرپرستِ اکابر

حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ
حضرت سید نفیس الحسینی —— مدظلہ
مولانا محمد اسحٰق صدیقی مدظلہ
مولانا حکیم محمود احمد ظفر مدظلہ
مولانا محمد عبداللہ مدظلہ
مولانا عنایت اللہ چشتی —— مدظلہ
مولانا محمد عبدالحق —— مدظلہ

رُفقاءِ فکر

—— سید عطاء المؤمن بخاری
—— سید عطاء المہیمن بخاری
—— سید عبدالکبیر بخاری
—— سید محمد ذوالکفل بخاری
—— سید محمد ارشد بخاری
—— سید خالد مسعود گیلانی
—— عبداللطیف خالد ● اختر جنجوا،
—— عمر فاروق عمر ● خادم حسین
—— قمر الحسنین ● بدر منیر احرار

زرِ معاونت اندرون ملک
فی پرچہ: =/۵ روپے
سالانہ: =/۵۰ روپے

بیرونِ ملک
سعودی عرب، عرب امارات مسقط، بحرین، عراق، ایران، مصر، کویت، بنگلہ دیش، انڈیا، امریکہ، برطانیہ، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، برما، نائیجیریا، جنوبی افریقہ، شمالی افریقہ ۳۰۰/ روپے سالانہ پاکستانی

پبلشر؛ سید محمد کفیل بخاری، پرنٹر؛ تشکیل احمد اختر، مطبع؛ تشکیل نیو پرنٹرز پرانی غلہ منڈی ملتان مقام اشاعت؛ دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

خط و کتابت کا پتہ؛ دارِ بنی ہاشم۔ مہربان کالونی ملتان (پاکستان) فون؛ ۷۲۸۱۳

آئینہ

مضمون	تحریر	صفحہ
دل کی بات	مدیر	۳
حمد	حافظ لدھیانوی	۵
فقیروں کی یونیورسٹی	عبدالغفور درخشن	۶
قتلِ عام اور غارت گری	انجمن فکر و عمل پاکستان	۱۳
شہنشاہ بجٹ اور جونِ خون	ابواسامہ	۱۵
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ شاہ جیؒ (نظم)	محمد اسحاق بھٹی	۱۷
	عاصی کرنالی	۳۱
کاروانِ خطابت کا آخری نقیب	عبدالمجید قریشی	۳۴
باتیں ہماری یاد رہیں گی	جناب مرزا محمد حسن چغتائی	۴۰
امیر شریعتؒ اور فرنگی خانقاہ کے درویش	مولانا قاضی محمد شمس الدین	۴۵
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور تحریک پاکستان	مولانا مدرار اللہ مدرار	۴۷

مضمون	تحریر	صفحہ
سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا بھبکویؒ	حامد سراج	۴۹
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ابراہیم لنکن	پروفیسر سید محمد کمل شاہ	۵۱
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شاعری	ڈاکٹر محمد امین	۵۲
زبان میری ہے بات ان کی	خادم حسین	۵۸ ۵۸
مجلس احرار کے راہنما حافظ محمد یوسف سیالکوٹی انتقال فرما گئے	سید محمد ارشد بخاری	۶۱
دین دشمنوں کو شکست دینے کیلئے بنیاد پرست مومن بن جائیے	چودھری بشارت علی	۶۲
وضاحت ۔ تبصرہ		۶۵
زبان خلق	قارئین نقیب ختم نبوۃ	۶۷
نغمے اور آنسو	اشرف عطاء	۷۱
دو مونچھوں کا بوجھ	منظر امروہوی	۷۲

دِل کی بات

بالآخر صدرِ مملکت قوم کے شدید مطالبے پر اپنی آئینی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے ۔ ۶ اگست کا سورج بے نظیر آمریت کے خاتمے کی نویدِ جانفزا لے کر طلوع ہوا اور بدعنوانی ، اقربا پروری ، غنڈہ گردی ، اخلاق باختگی اور لوٹ مار کی بساط لپیٹ کر غروب ہوگیا ۔ پیپلز پارٹی نے اپنے عہدِ اقتدار میں کیا کھویا کیا پایا ؟ اور ملک و قوم کو کیا دیا ۔ اس کا فیصلہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ۔ صدرِ مملکت نے جو چارج شیٹ لگائی ہے وہ اپنی جگہ مسلّمہ ہے لیکن ہمارے نزدیک ان دو برسوں میں دین کا مذاق اڑایا گیا ، شعائر اللہ کی توہین کی گئی ، دیندار اور شرفا کا جینا دوبھر کیا گیا ، عریانی اور فحاشی کو عروج بخشا گیا اور پوری بے شرمی کے ساتھ حدود اللہ پر تنقید کرکے انہیں ظالمانہ سزاؤں کا نام دیا گیا ۔ ملک کے تمام وسائل بلاول کے کھلونوں ، بختاور کے پنگھوڑے ، زرداریوں کی عرمستیوں اور جیالوں کی بدمستیوں کے لئے وقف کر دئے گئے ۔ قومی خزانے کو اس طرح لوٹا گیا کہ عہدِ رفتہ کی بدترین مثالوں کو بھی مات کر دیا گیا ۔ اور بلاول ہاؤس میں پاک سرزمین کا نظام ۔ لوٹ مار جبین شاد باد ، کے ترانے گونجتے رہے ۔ ہمارا ایمان ہے کہ پی پی پی حکومت حدود اللہ کی توہین کے جرم کے ارتکاب پر اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی ہے ۔ بیگم زرداری اقتدار کی شب باشیوں میں بدمست ہو کر یہ بھول گئیں کہ ؎

تجھ سے پہلے تیرا باپ یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ دن پلٹتے ہیں اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے ۔

نئی حکومت کے پرانے صدر غلام اسحاق خان ، وزیرِ اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی ، غلام مصطفیٰ کھر ، غلام حیدر وائیں اور کابینہ کے دیگر ارکان نے " اِحتساب " کو اپنی ترجیحات میں اوّلیت دی ہے ۔ اور ۲۴ اکتوبر کو انتخابات کے انعقاد کا اعلان بھی کیا ہے ۔ جس کا امکان مشکل ہے ۔ اتنے مختصر وقت میں " احتسابی عمل " کی تکمیل ممکن نہیں ۔ پھر یہ بھی واضح نہیں کہ احتساب کا معیار کیا ہے اور محتسب کون ہے ؟ افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق شہیدؒ کے زرّیں عہدِ اقتدار میں جس شخص کا احتساب کرکے ملک کی معزز عدلیہ نے اسے نااہل قرار دیا تھا وہ بھی آج محتسب ہے ۔ ہماری مراد ملک غلام مصطفیٰ کھر ہے ۔ ع

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

جنابِ صدر ! اپنے اردگرد بھی لاٹھی گھمائیے ۔ آپ نے پی پی پی کو پھر عوامی عدالت میں اپنی صفائی دینے کا موقع فراہم کرنے کی بات کی ہے اگر یہی بات تھی تو چارج شیٹ لگا کر معزول کرنے سے پہلے عوامی عدالت سے ریفرنڈم کراتے ۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مروجہ انتخابی طریقہ کار اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ۔ بیالیس برس سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے ۔ اگر احتساب کی ٹھانی ہے تو پھر مکمل احتساب کیجئے جن یورپی جمہوری معاشروں کی مثالیں دی جا رہی ہیں وہاں انہوں نے مجرموں کو اقتدار سے معزول کرکے ہمیشہ کے لئے نااہل قرار دے دیا ہے ۔ " نکسن ، مسٹر سوزوکی اور تناکا " کی مثالیں کافی ہیں ۔ موجودہ بحران جو مستقل بحران ہے اس کا پائیدار حل یہ ہے کہ انتخابات میں ووٹر اور امیدوار

دونوں کے لئے میرٹ مقرر کیا جائے۔ اور جن لوگوں کو قومی اور آئینی مجرم قرار دیا گیا ہے انہیں ہمیشہ کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔

موجودہ تبدیلی پر مختلف حلقوں نے اپنے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ "بیگم زرداری" نے کہا ہے کہ فوج ہمارے خلاف ہو گئی تھی سارا منصوبہ جی ایچ کیو میں تیار ہوا ہے"۔ کیا محترمہ اِس سے انکار کریں گی کہ فوج ہی انہیں اِقتدار پر لائی اور "تمغۂ جمہوریت" بھی آپ ہی نے فوج کو عطا کیا۔ پیپلز پارٹی کے حلقوں نے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ ہماری حکومت کا خاتمہ دراصل شریعت بِل کو سبوتاژ کرنے کی سازش ہے۔

پا بوسِ میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

اِس شریعت بِل والی تاویل کا جواب نہیں۔ اگر پی پی پی شریعت بِل سے اتنی ہی مخلص تھی تو اس کے خلاف باقاعدہ تحریک کیوں چلائی گئی، اسے اسمبلی میں متنازعہ بنا کر نامنظور کرنے کی راہ کیوں ہموار کی گئی۔ یہ سب تاویلیں ہیں جو اصل حقائق سے قوم کو بے خبر رکھنے کے لئے گھڑی جا رہی ہیں لیکن حقائق کب تک چھپائے جا سکتے ہیں۔ آخر انہیں ظاہر ہونا ہے۔ پی پی پی اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ مسئلہ افغانستان، مسئلہ کشمیر، اور عراق کویت کی تازہ ترین صورت حال پر اس کی حکومتی پالیسی بھی معزولی اقتدار کا ایک سبب ہے۔

ملک کی دینی جماعتوں اور علماء کرام کے لئے موجودہ صورتِ حال لمحۂ فکریہ اور ایک امتحان ہے اُن کی ذمہ داریاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر ایک موقع دیا ہے کہ وہ اپنی سابقہ سر پھٹول کی روش کو ترک کر کے سر جوڑ کے بیٹھیں اپنی منتشر قوت کو مجتمع کر کے حقیقی دینی انقلاب کی راہ ہموار کریں، قوم کی صحیح رہنمائی کریں، موجودہ حکومت بھی ہمارے لئے کوئی اسلامی حکومت نہیں۔ نئے وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے پہلے انٹرویو میں کہ دیا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے وقت پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس لئے ہمیں اِس حکومت کے بارے میں بھی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔

تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اک عجیب تھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

اِس سال محرّم میں امن و امان کی صورتِ حال نسبتاً بہتر رہی ہے لیکن بعض علاقوں میں انتظامیہ کا رویّہ نہایت قابلِ مذمت رہا ہے۔ جو امن و امان کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے۔ جام پور ضلع راجن پور میں احرار کارکن جناب منیر احمد احرار پر مقامی ایس ایچ او کی موجودگی میں رافضیوں نے قاتلانہ حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا وہ تاحال ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں مگر پولیس کوئی کارروائی نہیں کی۔ منیر احمد احرار کا جرم یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کا محافظ ہے۔ اسی طرح مجلس احرارِ اسلام تلمبہ کے کارکن جناب حافظ محمد اکرم صاحب کو پکڑ لیا پولیس نے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ ملتان سے جلسہ میں شرکت کے لئے پکڑ لیا پہنچے۔ پھر ان پر آوارہ گردی کے جرم میں مقدمہ درج کیا گیا۔ پولیس کا یہ رویّہ قابلِ مذمت ہے۔ ہم پنجاب حکومت اور پنجاب پولیس کے افسرانِ بالا سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان واقعات کی تحقیق کی جائے اور ذمہ دار پولیس افسران کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ منیر احمد احرار پر حملہ کے ملزموں کو گرفتار کیا جائے اور حافظ محمد اکرم پر قائم جھوٹا مقدمہ واپس لیا جائے۔

حافظ لدھیانوی

حمد

جو ہے معبود زمانے کا وہ تنہا تو ہے
جو کہ رزّاق ہے خالق ہے وہ یکتا تو ہے

تیری عظمت کے ترانوں سے ہے عالم معمور
دونوں عالم میں ہے جس ذات کا چرچا تو ہے

اک تری ذات زمانے میں ہے حیّ و قیّوم
نور ہے ارض و سماوات میں جس کا تو ہے

جو ہے مقصودِ دو عالم ہے وہ اک ذات تری
جس کی رٹتی ہے ہر اک دل کو تمنّا تو ہے

ہے ترے علم میں آفاق کا ذرّہ ذرّہ
راز سینوں کا ہے جو جاننے والا تو ہے

شب کی تنہائی میں کرتا ہوں میں تجھ سے باتیں
جس کا ہر سمت نظر آتا ہے جلوا تو ہے

ہر زباں پر ہے تری حمد ترانے تیرے
جس کی مدحت میں ہے مصروف زمانہ تو ہے

فکر محدود بھلا کیا تری توصیف کرے
جس کی قدرت کا نہیں کوئی کنارا تو ہے

بے طلب کرتا ہے ہر ایک کی حاجت پوری
جس سے شرماتا نہیں مانگنے والا تو ہے

بزمِ عالم کی ہے خلّاق تری ذاتِ کریم
جو ہر ایک کو دیتا ہے وہ داتا تو ہے

ہے ترے قبضۂ قدرت میں نظامِ عالم
خوف جس کا ہے سرِ حشر وہ آقا تو ہے

اس کے اشعار میں ہے تیری ثنا کی خوشبو
فکرِ حافظ میں رہا جس کا اُجالا تو ہے

لاہوت لامکان

فقیروں کی یونیورسٹی

لاہوت کے کرشمے

لاہوت لامکان کراچی سے شمال مغرب کی جانب تقریباً ایک سو پچیس میل کے فاصلے پر بلوچستان کے ضلع خضدار کے علاقہ "ساہونز" میں ایک بلند پہاڑی کے اندر واقع ہے لاہوت سے چار پانچ میل نیچے بلاول شاہ کا مزار ہے جس جگہ ہر سال رمضان کے مہینے میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے، رمضان کے پہلے دو ہفتوں میں اس میلے کی رونق جوبن پر ہوتی ہے سندھ

پنجاب، بلوچستان، سرحد اور کشمیر سے لوگ اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ اس موقعہ پر بسبب اطلاعت قسم کے نشے باز ملک کے کونے کونے سے لاہوت کے مقام پر حاضری دیتے ہیں۔ لاہوت پر ہر آنے والا مرد و عورت "لاہوتی" کہلاتا ہے اور لاہوت یاترا کے عمل کو "لاہوت کرنا" کہا جاتا ہے۔ فقیروں کے نزدیک لاہوت ایک بہت بلند منزل کا نام ہے۔

ایک لاہوتی ملنگ اس جگہ کا تعارف ان لفظوں میں کراتا ہے

"لاہوت لامکان کا مطلب ہے فقیروں کی یونیورسٹی۔ فقیر اس جگہ فقیری کا کورس پاس کرتے ہیں جس طرح لوگ لندن پاس کر کے آتے ہیں۔ اسی طرح فقیر لاہوت پاس کر کے جاتے ہیں"

لاہوت لامکان جیسی عجیب و غریب جگہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ جگہ کبھی بدھ راہبوں کا مسکن ہوگی مگر ہمارے ملنگوں کا کہنا ہے کہ:

"لاہوت عالم ارواح میں پنج تن پاک کا گھر تھا اور پھر جب عالم ظاہرت میں (جسمانی طور پر) پنج تن پاک مکہ میں تشریف لائے تو پھر بھی لاہوت کے ساتھ انکا ڈائریکٹ تعلق تھا کیونکہ لاہوت کے غار کے اندر جو سرنگ ہے وہ سیدھی مکے کو جاتی ہے"

ملنگوں کا لاہوت کے بارے میں مزید یہ کہنا ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے دنیا قائم کی تو لاہوت اسی وقت قائم ہو گیا۔" ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ لاہوت کا قرآن میں بھی ذکر ہے اور بابا آدم اور مائی حوا نے بھی لاہوت میں قیام کیا ہے۔

محبّت فقیر

محبّت فقیر کے مقام کو ہم لاہوتیوں کا ریسٹ ہاؤس کہہ سکتے ہیں۔ کراچی سے آنے والی سواریوں کا یہ آخری سٹاپ ہے اور سیہون شریف سے پیدل آنے والے قافلے بھی سب سے پہلے اسی مقام پر پہنچتے ہیں۔ اس مقام پر محبت فقیر کا پکا مزار ہے۔ زائرین سب سے پہلے اسی مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ محبت فقیر کا مزار بھی شاہ بلاول کے خلیفوں کے اندر ہے اور انہوں نے اس جگہ اپنا ایک تنخواہ دار ملنگ رکھا ہوا ہے جو اپنے ماتحت بے تنخواہ ملنگوں سے زائرین کے لیے پانی کے گھڑے بھرواتا ہے اور خود مزار سے زیادہ اس غلے کی حفاظت کرتا ہے جس میں زائرین نقدی ڈالتے ہیں۔

بتاتے ہیں کہ محبت فقیر شاہ بلاول کے طالب اور انکے فرمانبردار تھے اور آپ کی ہدایت پر انہوں نے اس جگہ اپنا ڈیرہ لگایا تاکہ مسافروں کی خدمت کی جا سکے۔ روایت کے

مطابق ہنوں کو جب اس کے بھائی بھنبور سے اٹھا کر کے کیچ لے گئے تو اس کی محبوبہ سستی ننگے پاؤں اپنے پریتم کی تلاش میں اسی راستے سے گزری تھی اور اسی راہ گزر پر سسی اور پنوں کی قبر آج بھی موجود ہے۔

مولا علیؓ کا پاؤں

محبت فقیر سے پیدل بلاول شاہ کی جانب جانے والا راستہ ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ جس کے کنارے کھجوروں کے کافی جھنڈ ہیں۔ ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد اسی راستے سے بائیں ہاتھ کی جانب ایک راستہ لاہوت کے پہاڑوں پر چڑھتا ہے، راستہ کے اسی سنگم پر نالے کے داہنی طرف یعنی عین محبت فقیر اور بلاول شاہ کے راستے میں ایک بڑے سے سل نما پتھر میں انسانی پاؤں کا نشان بنا ہوا ہے۔ ملنگ لوگ اسے "مولا علیؓ کے پاؤں کا نشان" کہتے ہیں۔ زائرین پاؤں کے اس نشان پر اپنا دایاں ہاتھ پھیر کر اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ دعا مانگتے ہیں اور پاؤں کے قریب پتھر پر کچھ پیسے رکھ کر چلے جاتے ہیں۔ پاؤں کے نشان کے قریب ایک جھاڑی

ملنگوں کے بقول شاہ بلاول دراصل حضرت علیؓ تھے جو شہید ہونے کے بعد اپنا تابوت اونٹنی پر لاد کر یہاں تشریف لائے

ہے جس کے نیچے مسافروں کے لیے پانی کے بھرے ہوئے مٹکے رکھے ہیں اور ساتھ ہی ایک پنجابی ملنگ کا ڈیرہ ہے! یہ ملنگ بھی شاہ بلاول کے خلیفوں کا تنخواہ دار ہے۔ حضرت علیؓ کا پاؤں دیکھنے کے بعد جب میں اس ملنگ کو سلام کرنے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کے ۶، ساتھی بھنگ رگڑ رہے تھے۔ پوست کی چائے بن رہی تھی اور سانپ کی شکل والی سلفیوں میں چرس بھر کر اس کے سوٹے لگائے جا رہے تھے اور پھر ایک رات جب میں بلاول شاہ کے مزار کے قریب منظور بخاری کی زیارت کے پاس بیش کی چٹائی پر آنکھیں بند کرکے لیٹا ہوا تھا تو مولا علی کے پاؤں کے نشان پر بیٹھنے والا ملنگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آکر میرے قریب بیٹھ گیا، پہلے دونوں چرس پیتے رہے اور بعد میں انہوں نے جیب سے نکال کر وہ رقم گنی جو کہ اس دن لاہوتیوں نے حضرت علیؓ کے پاؤں کے نشان پر بھینٹ کی تھی، آپ ساڑھے پندرہ روپے تھے اور یہ کیش وہ خلیفوں کے پاس جمع کرانے کے لیے لائے تھے۔

بعض ملنگوں کا کہنا ہے کہ شاہ بلاول ایک فرضی نام ہے دراصل یہ حضرت علیؓ تھے جو شہید ہونے کے بعد اپنا تابوت اونٹنی پر لاد کر خود اس جگہ تشریف لائے اور اس مقام پر دفن ہوئے۔ چنانچہ اسی موضوع پر ایک دوسرے ملنگ نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

• یہ مسئلہ غیبی ہے اس کا آپ سراغ نہیں لگا سکتے، آپ جو سوچ لیں وہی ہیں یہ، جو بات آپ کے دل میں آئے یہ وہی ہستی ہیں آپ نے دیکھ لیا، ذاتی اندر لاہوت میں ہے یا نہیں مولا علیؓ کی؟ مولا علیؓ کے پاؤں کا نشان نہیں دیکھا آپ نے؟ بس آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پردہ نہ اٹھاؤ۔ بھید کھل جائے گا۔

گوکل کا باغ

کہتے ہیں یہ باغ گوکل نامی ایک ہندو کی ملکیت تھا جس سے بلاول شاہ نے چھین لیا۔ بعض ملنگ گوکل کو ہندو نہیں بلکہ دیو بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق:

• یہ علاقہ پہلے جنوں اور پریوں کا تھا، اس وقت بھی ان پہاڑوں میں کافی جن اور پریاں موجود ہیں اور اس علاقے میں پریوں کا ایک کنواں بھی ہے، گوکل دیو بھی انہی پہاڑوں میں رہتا تھا، ایک دفعہ گوکل یہی باغ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کوہ قاف کے پہاڑوں سے لا رہا تھا کہ بلاول شاہ کی نظر اس پر پڑ گئی، آپ نے اپنی کرامت کے ذریعے اس جن کو نیچے اتارا، اس نے ہتھیلی والا باغ زمین پر رکھا اور بلاول شاہ کے ساتھ مقابلے پر اتر آیا۔ لہذا آپ نے اسے موجودہ باغ سے ایک میل دور اوپر پہاڑ میں ایک بڑی چٹان کے

اس وقت بھی ان پہاڑوں میں کافی جن و پریاں موجود ہیں

نیچے دفن کر دیا۔ دفن ہونے کے بعد اس چٹان میں سے گوکل دیو نے ایک چشمہ جاری کیا تاکہ کوہ قاف سے لایا ہوا اس کا باغ سیراب ہو سکے لہٰذا آج تک وہ چشمہ گوکل کی چٹان میں بہہ رہا ہے، باغ کو اسی سے سیراب کیا جاتا ہے اور مقامی آبادی کے لوگ اور زائرین یہی پانی استعمال کرتے ہیں۔

شاہ بلاول کے مزار پہ حاضری دینے والے زائرین کو ملنگ یہ ہدایت کرتے ہیں کہ وہ گوکل دیو کی چٹان پر جائیں اور اسے سات کنکریاں ماریں، لہٰذا ہر زائر گوکل دیو کو سات پتھر مار کے آتا ہے، گوکل کی چٹان کافی بڑی ہے، اس کے گرد کنکریوں کا ڈھیر ہے، کئی لوگوں نے اس چٹان پر اپنے نام لکھے ہوئے ہیں۔ چٹان کے نیچے سے چشمہ پھوٹتا ہے اور چشمے کے پانی میں چھوٹی چھوٹی سینکڑوں مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس بہتے ہوئے چشمے کے ساتھ ساتھ حکومت بلوچستان کی جانب سے کئی ایک مقامات پر چھوٹے بورڈ لگے ہوئے ہیں کہ پانی میں نہانا اور کپڑے دھونا منع ہے، کیونکہ یہ پانی پینے کے کام آتا ہے۔

گوکل کی چٹان کی طرف جاتے ہوئے راستے میں بلندی جگہ پر ایک کوٹھڑی نما مختصر سی غار ہے۔ وہاں ایک سندھی ملنگ بیٹھا ہوا ہے وہ بتاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس غار میں قیام کیا تھا۔ غار کے اندر دیا جل رہا ہے اور دیئے کے پاس زائرین کے پھینکے ہوئے پیسے اور چرس کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

ستو بنجو کی سمادھی

بلاول شاہ کے مزار کے ساتھ ہی مسجد ہے مسجد کی سیڑھیوں کے ساتھ وضو کرنے کی جو ٹوٹیاں لگی ہوئی ہیں، ان کے سامنے سفید سنگ مرمر کی ایک سمادھی ہے، یہ ستو بنجو کی زیارت ہے۔

ستو بنجو ایک ہندو تھا۔ اس کی سات لڑکیاں تھیں۔ ان کی شادی کے لیے اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا ایک دفعہ ہندو بلاول شاہ کے پاس آکر سوالی ہوا کہ مجھے بیٹیوں کی شادی کے لیے کچھ عنایت کیا جائے بلاول شاہ نے اسے کہا کہ میرے باغ کے گرے ہوئے پتوں کو بورے میں بھر کر لے جاؤ، وہ خشک پتوں کا بورا بھر کے اپنے گھر لے گیا، وہاں جا کے دیکھا تو وہ پتے نوٹ بن چکے تھے، لہٰذا اس نے اپنی ساتوں لڑکیوں کی شادی نہایت دھوم دھام سے کی اور نورانی کی دعا سے اس کے ہاں لڑکا بھی پیدا ہوا وہ ہندو آ کے نورانی کے قدموں میں گر گیا اور یہیں عبادت کرنے لگا ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کا دم نکل گیا اور اس کے گرد سمادھی بنا دی گئی۔

ستو بنجو کی سمادھی پر محرم کی سات تاریخ کو ہندوؤں کا ایک میلہ لگتا ہے۔ سندھ، بلوچستان اور بعض اوقات بھارت سے بھی ہندو لوگ اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔

خلیفے اور ملنگ

کافی برسوں سے لاہوت آنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ بیس پچیس سال قبل بہت کم لوگ لاہوت گھومنے آتے تھے۔ اس وقت اس جگہ کوئی خلیفہ نہیں ہوتا تھا، بلاول شاہ کے مزار پر اردگرد کے لوگ آ کر کبھی کبھار جھاڑو دے جاتے تھے۔ شاہ بلاول سے زائرین جب لاہوت کرنے جاتے تو لاہوت سے قریب ہی تھوڑے فاصلے پر ایک خانہ بدوش بوڑھی خاتون زائرین کی خدمت کرتی، کھانے کے علاوہ انہیں سونے کے لیے چٹائیاں بھی دیتی، یہ بوڑھی خاتون اب بھی وہاں رہتی ہے بہت ضعیف ہے۔ سوائے بڑہی کے اور کوئی زبان نہیں جانتی، وہ اپنی حیثیت کے مطابق اب بھی مسافروں کی خدمت کرتی ہے جس روز ہم اس خاتون کی جھگی میں گئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی بیٹی نے ہمیں بکری کا دودھ پلایا۔ میں نے ایک لاہوتی سے سنا کہ خلیفہ صاحب اور ان کے کارندے اس نیک دل مائی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے اور اسے اور اس کے خاندان کو اپنے راستہ کا کانٹا خیال کرتے ہیں۔ لاہوتی لوگ خاص کر خواتین اس بوڑھی خاتون کی بہت عزت کرتی ہیں اور لاہوت سے واپسی پر اسے سلام کر کے جاتی ہیں۔

جب اس جگہ لوگ زیادہ تعداد میں آنا شروع ہوئے تو سندھی سید صالح شاہ والوں نے بلاول شاہ میں آ کر اپنی گدی قائم کی، سندھی سیدوں کی مدد سے بلاول شاہ اور لاہوت پر آنے والے زائرین کی تعداد چند برسوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی اور اس لحاظ سے گدی نشینوں کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہوا، چنانچہ نتیجے کے طور پر بارہ تیرہ سال قبل صالح شاہ والوں کو ملنگوں نے اپنے باندلی

کی طاقت سے اپنے علاقے سے نکال باہر کیا اور اپنے قبیلے کے مقامی لوگوں کو سندھی سیدوں کی جگہ خلیفے نامزد کر دیا، موجودہ بروہی خلیفے چونکہ سندھی سیدوں کے گھر کے بھیدی تھے چنانچہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد انہوں نے کسی بھی مقامی آدمی کو اپنی انتظامیہ میں شامل نہیں کیا، لہذا موجودہ خلیفے مرکزی گدی یعنی بلاول شاہ کے مزار پر خود بیٹھتے ہیں اور دوسری تمام کم آمدنی والی جگہوں پر یہ سندھی، پنجابی اور پٹھان ملنگوں کو "ایڈ ہاک" پر رکھتے ہیں ان بیرونی ملنگوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ "ٹرانسفر" ہوتی رہتی ہے اور ایک دو سال کے بعد پرانے ملنگوں کو نکال کر نئے ملنگ بھرتی کر لیے جاتے ہیں۔

بیرونی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ملنگ باوجود نشئی ہونے کے بڑے چست چالاک ہیں وہ زائرین کو جی بھر کر لوٹتے ہیں اور لوٹ کے اس مال میں سے کافی حصہ اپنے پاس رکھ کر باقی رقم ہر روز خلیفہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں، یہی حال خلیفہ صاحب کا ہے وہ مرکزی اور بیرونی گدیوں کی کمائی میں سے بہت سا مال غائب کر کے باقی رقم کا حساب مینگل وڈیروں کو دیتا ہے۔

جس روز میں بلاول شاہ سے لاہوت پیدل گیا تو میں نے سیون سے قافلہ کے ساتھ پیدل آئے ایک نوجوان ملنگ غلام عباس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ بلاول شاہ کے دربار پر سندھ اور پنجاب سے آئے ہوئے ایسے کئی ملنگ آپ کو مل جائیں گے جن کا کام ہی لوگوں کو لاہوت کرانا ہے، اس کام کی اجرت یہ ملنگ لوگ دو وقت کے کھانے، چائے کی دو پیالیوں، دس بیس روپوں، سگریٹ کی ایک ڈبی نمبر ماچس اور چرس کی پانچ گولیوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ غلام عباس ملنگ بھی انہی میں سے ایک تھا اور روزانہ کسی نہ کسی پارٹی کو لاہوت لے کر جاتا تھا۔ جب ہم لاہوت کی کٹھن اور نہایت دشوار اترائی اتر کر ننگے پاؤں گدی پر بیٹھے ملنگ کے پاس گئے تو اس وقت وہاں ایک مچ کے سامنے خلیفوں کے دو تنخواہ دار ملنگ بیٹھے تھے، ان میں سے ایک پنجابی اور دوسرا پٹھان تھا، پنجابی کی داڑھی کالی تھی، وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا اور نشے کی حالت میں اس کی شکل اور بھی ڈراؤنی نظر آ رہی تھی، اُسے میرے آنے کا پہلے سے علم تھا۔ قبل اس کے کہ میں اس سے انٹرویو لیتا۔ جاتے ہی اس نے میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ نہایت رعب اور دبدبے کے ساتھ اس نے مجھ سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔

• تم کیسے والے ہو؟

میں نے کہا "نہیں"۔

• تم سرکاری ملازم ہو؟

میں نے اس سے بھی انکار کیا۔

• تم کہاں سے آئے ہو؟

• میں فیصل آباد سے آیا ہوں"

• کونسے محلے سے؟

میں نے اپنے محلے کا نام بتایا

لاہوت والے ملنگ نے مجھے کوئی بھی بات بتانے سے انکار کر دیا اور بلاول شاہ واپس جا کر خلیفے سے رجوع کرنے کو کہا اور مزید سوال کرنے کی صورت میں اس نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی۔

• دیکھو میری بات سنو، آپ کو ایک بات بولوں، آپ ادھر جب بھی آئیں، ادھر سلام کریں، معافی مانگیں اور (چٹکی بجا کے) بس! چلے جائیں، کسی نے اگر کچھ پوچھا تا! جس نے کوئی بات کیا، وہ گیا"

میرے پاس چھوٹا سیکرٹری ٹیپ ریکارڈر تھا جس میں میں نے اس کی تمام دھمکی آمیز گفتگو ریکارڈ کر لی اور آخر جب اسے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر ہے تو اس نے سختی سے مجھے حکم دیا کہ میں ٹیپ ریکارڈر اس کے حوالے کر دوں، میں نے اسے باتوں میں لگا کر کیسٹ نکال کر جیب میں ڈال لی اور ریکارڈر اس کے حوالے کر دیا، جب ہم لاہوت کے غار کے اندر سے ہو کر واپس لوٹے تو ریکارڈر اس نے مجھے واپس کر دیا اور میرے گائیڈ ملنگ غلام عباس کو اس نے میرے سامنے برا بھلا کہا کہ وہ مجھے وہاں کیوں لے کر گیا اور آئندہ کے لیے اس پر "بین" لگا دیا کہ وہ کسی زائر کے ساتھ یا اکیلا آئندہ کبھی لاہوت پر نہیں آسکتا، اور یوں میری وجہ سے فرزند علی اور غلام عباس کا روزگار متاثر ہوا۔ اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا۔

نشے اور موالی

لاہوت جانے والے ملنگوں میں میں نے ایک آدمی بھی ایسا نہیں دیکھا جو نشہ نہ کرتا ہو، بلاول شاہ نورانی کے مزار کے قریب لوگ جھونپڑیاں لگا کر چرس، بھنگ، افیون، پوست کے ڈوڈے، راکٹ اور ہیروئن بیچ رہے تھے۔ چرس اس جگہ چلموں میں بھر کر پی جاتی ہے۔ لوگ ملنگوں کو عقیدت کے طور

پر چرس کی گولیاں پیش کرتے ہیں۔ کئی لاہوتی ایسے تھے جنہوں نے منت مانی تھی کہ لاہوت پر جاکر پانچ چھٹانک چرس اور پانچ تولے افیون ملنگوں میں تقسیم کریں گے۔ لہٰذا کئی جگہوں پر میں نے ملنگوں میں نشہ آور چیزیں تقسیم ہوتے ہوئے دیکھیں۔ راکٹ اور ہیروئن کی لت اب ملنگوں میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ میں نے ایک ہی وقت میں بائیس ملنگوں کو بلاول شاہ کے باغ میں ہیروئن کے نشے میں زمین پر مردوں کی طرح پڑے ہوئے دیکھا اور جب کراچی سے ہم محبت شاہ جارہے تھے تو راستے میں لنگ لوہار نامی ایک جگہ پر ہماری بس چائے کے لیے رکی، ایک اور بس تو محبت فقیر سے کراچی کے لیے آئی تھی اس کے مسافر بھی وہاں چائے پی رہے تھے وہاں ایک لاہوتی ایسے موالیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نشہ آور چیزیں تقسیم کر رہا تھا جو کہ نشہ ختم ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ایک سیاہ پوش ملنگ (جو منگوپیر سے پیدل آیا تھا اور لاہوت جا رہا تھا) نے جب اس لاہوتی کو منشیات تقسیم کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پاس پہنچا اور بہت سے موالیوں میں سے بازو گھسیٹ کر اس نے اپنا چپیہ (کشکول) اس لاہوتی کے سامنے کر دیا۔ لاہوتی نے ملنگ کے چپیے میں چرس کی دو تین ڈلیاں ڈال دیں تو پھر بھی ملنگ نے بدستور اپنا چپیہ اس کے سامنے رکھا، لہٰذا اس نے تھوڑی سی افیون چپیے میں گرائی۔ ملنگ نے پھر بھی نہ ہٹایا۔ لاہوتی اس وحشت زدہ ملنگ کی شکل دیکھ کر مسکرایا اور اپنی جیب سے ایک راکٹ نکال کر اس کے چپیے میں ڈال دیا۔ ملنگ علیؑ کا نعرہ لگا کر جنبہ مجمعے سے باہر لے آیا اور چٹائی پر بیٹھ گیا اس نے چرس کی گولیاں چپیے سے نکال کر جیب میں ڈالیں۔ راکٹ یعنی نشے کا کیپسول کھول کر اس کا پاؤڈر چپیے میں جھاڑا۔ افیون اس چپیے میں پہلے سے موجود تھی وہ چار پانچ منٹ تک راکٹ کے پاؤڈر اور افیون کو مکس کرتا رہا۔ بعد میں اس نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر انڈیلا اور منہ کھول کر افیون ملا راکٹ ایک ہی جھٹکے میں پھانک لیا اور اپنی کمر سے لٹکی ہوئی پانی کی فوجی بوتل اتار کر منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں بوتل خالی کر کے اسے قریب رکھے مٹکے سے بھر کر دوبارہ کمر کے ساتھ باندھا علیؑ کا ایک اور نعرہ لگایا اور لاہوت کی طرف پیدل روانہ ہو گیا۔

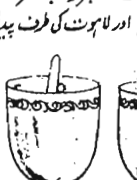

لاہوت کے عجائبات سنگ

لاہوت اور بلاول شاہ کے راستے میں ایک کشتی نما پہاڑ ہے جسے لوگ "نوح کی کشتی" اور بعض لوگ پنج تن پاک کی کشتی کہتے ہیں۔ اسی کشتی کے پاس راستے میں ایک پہاڑی چوٹی پر بالکل ثابت مسور کی طرح کے اور اسی سائز اور رنگت کے چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے ہیں۔ انہیں لوگ "نورانی کے مسور" کہتے ہیں اور تبرک کے طور پر اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔

لاہوت دراصل ایک گلاس کی شکل کا نہایت تنگ اور گہرا گڑھا ہے۔ اس کے نیچے اترنا گویا ایک آتش فشانی دہانے کے برابر ہے، دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر ایک سال کے بچے کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر اور پھسل پھسل کر نیچے اترنا پڑتا ہے گو کہ بعض مشکل جگہوں پر لوہے کی سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں، لیکن وہ بھی انتہائی تکلیف دہ ہیں۔ ان سیڑھیوں کے ڈنڈے سریے کے بنے ہوئے ہیں۔ زائر کے لیے اپنے معمولی سامان لے کر بھی نیچے اترنا مشکل ہے۔ میں اپنے ٹیپ ریکارڈر کی ڈوری کو دانتوں میں پکڑ کر نیچے اترا۔

خدا خدا کر کے مسافر ایک ایسی جگہ اترتے ہیں جہاں ان کے سر پر پہاڑ چھجے کی صورت میں جھکا ہوتا ہے، پہاڑی چھجے کے نیچے ایک مچ جل رہا ہے جس پر ملنگ گدی لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ مچ میں موٹی موٹی لکڑیاں ہیں اور ان میں سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا ہے۔ سندھ اور پنجاب کے بڑے بڑے مزاروں کے مچوں میں جو بارہ مہینے آگ جلتی رہتی ہے وہ آگ لاہوت کے اسی مچ سے جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی مچ کی آگ بجھ جائے تو اس دربار کے ملنگ سینکڑوں میل کا سفر پیدل کر کے دوبارہ لاہوت کے اس مچ سے آگ لے کر جاتے ہیں کسی نزدیکی دربار سے انہیں لاہوتی آگ حاصل کرنے کا حکم نہیں ہے۔

پہاڑی چوٹی سے اس چھجے کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک جھرنا مچ والے ملنگ کے بالکل سامنے پچیس تیس قدم کے فاصلے پر گر کر ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ اوپر کافی بلندی سے برگد کے درخت کی داڑھی کی طرح پہاڑ کی پتھریلی جڑیں چھجے کے اندر اوپر سے نیچے کی جانب لٹکی ہوئی ہیں اور متواتر پانی رس رس کر وہ جڑیں کلر کی وجہ سے سفید رنگ کی یہ پتھریلی جڑیں لاہوت میں آنے والے سیاح کو ایک عجیب و غریب نظارہ پیش کرتی ہیں، ان پتھریلی جڑوں کی سفید رنگت کے بارے میں ملنگوں کا یہ کہنا ہے کہ جس وقت مولا علیؑ، اس جگہ تشریف لائے تو آپ کی آمد کی خوشی میں لاہوت پر دودھ کی بارش ہوئی تھی اور یہ سفیدی اسی دودھ کی ہے۔ لہٰذا ان پہاڑی جڑوں پر

سے منسلک لوگ سفید پاؤڈر اکھٹا کرکے اپنے پاس رکھتے ہیں اور لاہوتیوں کو تبرک کے طور پر دیتے ہیں جسے وہ واپس جا کر مختلف بیماریوں کے لیے علاج کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ

اس پہاڑ میں کوئی ایسی معدنی چیز ہو جس کے استعمال سے مریض کو شفا [illegible] ہو۔

زائرین باری باری پیچ کے پاس آکر ملنگ کو سلام کرتے ہیں، اسے نذرانہ اور روٹ پیش کرتے ہیں اور سامنے کی زیارتوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

ملنگ کی گدی کے بالکل سامنے جس پتھر پر جھنڈا گر رہا ہے، وہ پتھر ایک بہت بڑے سانپ کی شکل کا ہے جس نے اپنا پھن اوپر کو اٹھایا ہوا ہے، اس کے پیچھے ایک چھوٹا سانپ ہے جسے وہ بڑے سانپ کی مادہ بتاتے ہیں۔

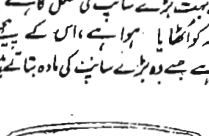

وہاں کھڑا ایک ملنگ تقریر کر رہا تھا:

"جناب! یہ لاہوت لامکان بزرگوں کی چلّہ گاہ ہے اس جگہ پر چلّہ کرنے والے کو مولا علیؓ کا دیدار نصیب ہوتا ہے، وہ سامنے جو جگہ ہے وہاں بلاول شاہ نورانی نے چلّہ کیا تھا اور پنج تن پاک نے آکر ان کی رہبری کی تھی، یہ شہباز قلندر کی چلّہ گاہ ہے، وہ سامنے لطیف بھٹائی کی چلّہ گاہ ہے، یہ باہر جتنی بھی چلّہ گاہیں ہیں یہ سب پیروں فقیروں کی ہیں۔ صرف پنج تن پاک کی چلّہ گاہ غار کے اندر ہے۔ بڑے بڑے بزرگ اس جگہ پر آئے ہیں۔ داتا گنج بخشؒ خواجہ غریب نوازؒ اور بری، شاہ لطیف بھی یہاں تشریف لائے تھے۔"

"کیا یہ تمام بزرگ یہاں تشریف لائے تھے؟" میں نے جھجکتے ہوئے اپنے ملنگ سے سوال کیا۔

تو اور کیا! آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟ یہ تمام بزرگ لاہوت پر آئے ہیں حتیٰ کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو گزرے ہیں وہ سب یہاں آئے ہیں، ان میں کچھ تو جسمانی طور پر یہاں آئے اور باقی روحانی طور پر کیونکہ روحانی طور پر بزرگ ہر جگہ جا سکتے ہیں۔" دلیل کافی وزنی تھی لہٰذا خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔

ایک بلند پہاڑی دیوار کے ساتھ چلتے چلتے ملنگ کھڑا ہو گیا، پہاڑی دیوار میں نو دس فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹا سا بیضوی شکل کا سوراخ تھا، سوراخ کے قریب پتھر میں کیل ٹھونک کر ایک رسہ اس کے ساتھ باندھا گیا تھا اور وہ رسہ نیچے لٹک رہا تھا، کچھ عرصہ پہلے تک زائرین اسی رسے کی مدد سے اس سوراخ تک پڑھتے تھے، لیکن اب رسے کے ساتھ ساتھ لوہے کے سریئے کی سیڑھی بھی لگی ہوئی ہے، لیکن یہ سیڑھی اتنی تکلیف دہ ہے کہ اب بھی زیادہ زائرین رسے ہی کی مدد سے اوپر سوراخ تک پہنچتے ہیں۔ پہاڑی کے اس سوراخ کو لاہوتی لوگ "ماں کا پیٹ" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سوراخ حرامی اور حلالی کے بارے میں کسوٹی ہے یعنی حرامی آدمی چاہے کتنا بھی کمزور کیوں نہ ہو، اس سوراخ میں سے نہیں گزر سکتا جبکہ حلالی اگر موٹا انسان بھی ہو تو آسانی سے گزر جاتا ہے۔ کئی ملنگ غار کے اس منہ کو محمدی دروازہ کہتے ہیں اور اس کے اندر جو غار ہے اسے پنج تن پاک کا گھر کہا جاتا ہے۔ ملنگوں کا کہنا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ اسی سوراخ یعنی محمدی دروازے کے باہر کھڑے ہو کر غار کے اندر جھولے میں لیٹے ہوئے امام حسنؓ حسینؓ کو جھولا جھلایا کرتے تھے، کیونکہ وہ نبیؐ کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ امام حسنؓ حسینؓ کا جھولا جو کہ اب پتھر کا ہو چکا ہے اس غار کے اندر موجود ہے۔

رسے اور سیڑھی کی مدد سے [illegible] مشکل سے غار کے منہ کے قریب پہنچتا ہے، غار کے منہ سے اندر کی جانب رسے کی مدد سے اترنا پڑتا ہے۔

غار میں اترتے وقت جس پتھر پر آدمی کا سب سے پہلے پاؤں پڑتا ہے وہ پتھر شیر سے مشابہہ ہے کہتے ہیں کہ شیرِ خدا اس شیر پر سواری کرتے تھے اور آپ نے اسے اسی جگہ پر پتھر کر دیا تاکہ انہیں ماننے والے اس شیر پر پاؤں رکھ کر آسانی سے غار میں اتر سکیں۔

پتھر کے شیر پر پاؤں رکھ کر رسے کی مدد سے جب آدمی غار کے اندر اترتا ہے تو اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، بالکل ایسے لگتا ہے جیسے وہ فلم چلنے کے بعد سینما ہال کے اندر داخل ہوا ہو۔ گائیڈ ملنگ اندر داخل ہونے والوں کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ نیچے جھک

کر فرش پر گرے ہوئے پانی کو آنکھوں سے لگائیں تاکہ ان کی آنکھوں کو روشنی میسر آئے اور وہ اندر کی ہر چیز دیکھنے کے قابل ہو سکیں لہذا

تمام زائرین نیچے جھک کر اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد تاریکی کچھ چھٹ جاتی اور اس نیم تاریک ماحول میں انسان اپنے آپ کو ڈیڑھ دو کنال بڑے ہال میں کھڑا پاتا ہے، اس غار نما ہال یا ہال نما غار کی چھت چودہ پندرہ فٹ اونچی ہوگی اور اس غار میں ہوا اور روشنی کے لیے وہی ایک سوراخ ہے جس میں سے زائرین گزر کے آتے ہیں۔

غار کے اندر پتھروں کے دو قدرتی برتن بنے ہوئے ہیں جن کے اندر اوپر غار کی چھت سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے اور یوں یہ برتن ہر وقت پانی سے بھرے رہتے ہیں اس پانی کو لاہوتی لوگ "آب زمزم" کہتے ہیں اور اپنے ہمراہ تبرک کے طور پر لے کے جاتے ہیں۔ پانی پتھر کے برتنوں سے چھلک کر غار میں چاروں طرف پھیلا

ہوا ہے جس کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ پھسلن بھی ہے لہذا غار میں داخل ہوتے ہی یہی "آب زمزم" جھک کر آنکھوں پہ لگایا جاتا ہے، ملنگوں کا کہنا ہے کہ کئی پیدائشی اندھے بھی اس پانی کو آنکھوں پہ لگانے کے بعد بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں:

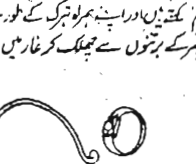

اس نیم تاریک ماحول میں ایک تو ویسے ہی انسان کو غار کے اندر کی ہر چیز حتیٰ کہ خود اپنا وجود تک عجیب و غریب نظر آتا ہے، دوسرے اس جگہ آتے آتے نفسیاتی طور پر زائر کی یہ پوزیشن ہو جاتی ہے کہ ملنگ جس پتھر کا جو نام بتائے اسے واقعی وہ پتھر اسی شکل میں نظر آتا ہے۔

چنانچہ غار کے اندر ٹیڑھے میڑھے پتھروں کی طرف اشارہ کر کے ہمارے ملنگ نے دوبارہ گائیڈ والی تقریر شروع کی:

" یہ دیکھیے جناب! یہ حضرت امام حسنؓ حسینؓ کا جھولا ہے۔ یہ مولا علیؓ کا تخت ہے، یہ مولا علیؓ کی دُلدُل ہے۔ یہ پنج تن پاک کی چلّہ گاہ ہے، یہ مولا علیؓ کی اونٹنی ہے، اسی اونٹنی پر مولا اپنا تابوت لاہوت لے کر آئے تھے۔ یہ خاتونِ جنت کی چکی ہے، یہی چکی بی بی فاطمہؓ کو نبیؐ نے جہیز میں دی تھی، یہ مولا علیؓ کی چھڑی ہے، یہ بی بی فاطمہؓ کا صابن ہے، آپ اس پر ہاتھ لگا کر سونگھیں آپ کو صابن کی بو آئے گی۔ جس بی بی کے چہرے پر کوئی بیماری ہو وہ اس صابن پر ہاتھ پھیر کر چہرے پہ مل لے تو کوئی نشان اور بیماری باقی نہیں رہتی۔ یہ جناب آپ دیوار کے ساتھ پتھر کا گول سا پلر دیکھ رہے ہیں۔ یہ قیامت کا ستون ہے، یہ ستون آہستہ آہستہ چھت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب یہ صرف ایک آدھ فٹ چھت سے نیچے رہ گیا ہے۔ جس روز یہ ستون چھت پہ جا لگا، اسی روز قیامت آجائے گی"

سب سے آخر میں ملنگ تمام لوگوں کو اس وسیع غار کے آخری سرے پہ لے جا کر مزید ایک غار کا منہ دکھا کر بتایا ہے کہ:

"یہی وہ سرنگ ہے جو مکے مدینے کو جاتی ہے، اگر آدمی اس راستے مکہ جانا چاہے تو تین دن میں وہاں پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اب اس سرنگ سے کوئی آدمی نہیں جا سکتا، کیونکہ مولا علیؓ نے حکم بند کر دیا ہے، پنج تن پاک اسی سرنگ کے راستے لاہوت آیا کرتے تھے۔"

سرنگ دیکھنے کے بعد زائرین نے "آب زمزم" کے "مٹکوں" سے پانی کے برتن بھرے جو وہ اپنے ہمراہ بڑی دشواری کے ساتھ لائے تھے، غار کے منہ یعنی "ماں کے پیٹ" میں سے اسی طرح باہر آئے، لاہوت کے ملنگ سے اپنے روٹ کا آدھا آدھا ٹکڑا اور لاہوت کے پہاڑ کے دو دو کی ایک ایک پڑیا لے کر جس راستے سے نیچے آئے تھے اسی راستے سے ہم لوگ واپس اوپر پہنچے، لوہر کے ہوٹل سے سامان اٹھایا اور رات آٹھ نو بجے کے قریب ہمارا قافلہ واپس بلادل شاہ پہنچا۔

ممتاز محقق مولانا حکیم محمود احمد ظفر کی نئی کتابیں

- اسلام اور عورت کی حکمرانی
- فتنۂ جمہوریت۔
- صحابہ کرامؓ اور اہل بیتِ نبوت کے تعلقات اور رشتہ داریاں

دفتر "نقیب ختم نبوت" سے طلب فرمائیں!

۔ انجمن فکر و عمل پاکستان

قتلِ عام اور غارتگری کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟

جاگیردار طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ میں کامیاب رہا ہے

مسلمانانِ ہند کی مشترکہ کوششوں سے جب پاکستان عالمِ وجود میں آیا تو سندھ ملک کا وہ واحد صوبہ تھا جہاں مخدوموں' سیدوں' اور وڈیروں کی جاگیرداری اور عمل دخل تھا۔ صوبہ کے وسیع و عریض علاقے پر ان ہی جاگیرداروں کا تسلط تھا جن کی اکثریت ان اسماعیلی' فاطمی اور قرامطی شیعوں کی اولاد ہے جو ماضی میں ایران اور عراق سے آکر ملتان اور سندھ پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ برطانوی دور میں یہی استحصالی طبقہ اپنی مسلم رعایا کے جان و مال اور عزت آبرو سے ہمیشہ کھیلتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد خیال تھا کہ یہاں جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے گا اور مظلوم رعایا ان کے ظلم و جبر سے آزاد ہو سکے گی۔ لیکن حکومت کے بیورو کریٹ طبقہ کی ملی بھگت سے جن میں اکثریت شیعہ افسران کی تھی اور جو انتظامی معاملات میں سیاہ و سفید کے مالک تھے سندھ کا جاگیردار طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کامیاب رہا۔ لیکن نئے سندھیوں سے میل ملاپ اور خلط ملط سے سندھی عوام میں بیداری کی روح پیدا ہوئی اور وہ ان آقاؤں سے اپنے شہری اور انسانی حقوق چھیننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور جاگرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاریوں کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر ان مٹھی بھر مخدوموں' سیدوں' پیروں اور وڈیروں کو اپنی جان و مال کے لالے پڑ گئے۔

ان کو نئے سندھیوں سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہ تھی جن کے ساتھ وہ کوئی تیس سال سے میل و محبت اور بھائی چارہ کی فضائیں پر امن زندگی گذارتے رہے تھے' پھر ان ہی مخدوموں' سیدوں' پیروں اور وڈیروں کا سرخیل' اور ہم مذہب ذوالفقار علی بھٹو جب صدر یحیٰی کی حمایت سے برسرِ اقتدار آیا تو اس نے اپنی برادری کے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر اپنے خلاف سندھی مسلمانوں کے غیظ و غضب کو نہایت عیاری سے نئے سندھیوں کے خلاف موڑ دیا اس نے سندھی آبادی کو شہری اور دیہی' پرانے اور نئے سندھی کے الگ الگ خانوں میں بانٹ کر بھائی بھائی کے درمیان نفاق و نفرت کی دیوار کھڑی کر دی۔ ایسے امتیازی قوانین وضع کئے جس سے نئے سندھیوں کی حق تلفی ہوئی۔ اور وہ ہر طرح کی جائز مراعات سے محروم کر دیئے گئے۔ اس استحصالی گروہ نے جی ایم سید قرامطی شیعہ کی سرکردگی میں ایک پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا اور پرانے سندھیوں کو یہ باور کرایا گیا کہ سندھی عوام کا استحصال کرنے والے دراصل نئے سندھی ہیں جب کہ جاگیردار طبقہ ان کا محسن ہے جو حقوق کی بازیابی میں ان کا معاون و مددگار ہے۔ سندھی نوجوانوں کو اس طرح سبز باغ دکھا کر اس شیعہ طبقہ نے عوام کو آپس میں دست و گریباں کر کے ایک طرف اپنے مفادات کو تحفظ دیا تو دوسری طرف سندھ کو غیر سندھیوں سے پاک کرنے اور ایک الگ آزاد ملک بنانے کے لئے ایک ماسٹر پلان پر گذشتہ کئی برسوں سے عمل درآمد شروع کر رکھا ہے۔

استحصالی گروہ نے شیعہ قرامطیوں کی سرکردگی میں پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا

ثبوت کے طور پر جیے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن مورخہ ۱۹ اگست ۸۶ء کے پانچ نکاتی خفیہ ہدایت نامہ سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ جو جی ایم سید کے اصل عزائم کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ جو ہفت روزہ ''تکبیر'' میں شائع ہوا۔

☆ ۱۔ ''جیسا کہ آپ کو ہدایت دی گئی ہے' آپ اپنی جدوجہد کا نشانہ صرف پنجابی کو بنائیں اور مہاجروں کو اپنے ساتھ ملا کر چلیں'' ۔

☆ ۲۔ ''ہم اپنی پیاری دھرتی سندھڑی کے دشمنوں کو آپس میں لڑانے میں کامیاب ہو گئے ہیں ۔ آپ نے دیکھا کہ پنجابی سامراج اور مکڑوں (مہاجروں) کی آپس میں نہیں بنتی۔ پٹھان اور بہاری آپس میں لڑ رہے ہیں۔۔ اب ایسا لگتا ہے کہ یہ سندھ کے دشمن ایک نہیں ہو سکتے'' ۔

☆ ۳۔ ''ہمیں اس پر مطمئن نہیں ہونا چاہئے جب تک سندھ کے دشمن مہاجر' پٹھان اور بہاری کو نکال لیں۔ جب تک یہ سانپ نہیں مریں گے اس وقت تک سندھ آزاد نہیں ہو گا'' ۔

☆ ۴۔ (تعلیمی اداروں سے غیر سندھیوں کو نکالنے سے متعلق ہے)

☆ ۵۔ ''جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مہاجر اپنے بھائی اور باقی سب دشمن' لیکن آپ کو یاد رکھنا ہو گا کہ جیسا دشمن ناگ' ایسا ہی دشمن لنڈی (مہاجر) ان لنڈیوں (مہاجروں) نے سندھ کی تجارت' صنعت اور ملازمتوں میں جتنا سندھ کا استحصال کیا ہے' اتنا شیش ناگ سانپوں جیسے دشمن نے بھی نہیں کیا۔ ان

غیر سندھیوں کے خلاف خاک و خون کے خونیں ڈرامے کا ڈراپ سین کھیلا جا رہا ہے

''آپ اپنی جدوجہد کا نشانہ صرف پنجابی کو بنائیں اور مہاجروں کو ساتھ ملا کر چلیں''

لنڈیوں کو مارنے کے لئے بھی جدوجہد کرنی ہے لیکن وقت سے پہلے نہیں۔ کیونکہ یہ لنڈیاں شہر میں رہتی ہیں۔ ابھی ہم کو ان کی ضرورت ہے ان دشمنوں (پنجابیوں اور پٹھانوں) کو ان لنڈیوں (مہاجروں) ہی کے ذریعہ مارنا ہے کیونکہ بیوقوفی کا زمانہ نہیں۔ کام ایسا کرنا ہے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔

آج سندھ کے شہروں اور دیہی علاقوں میں غیر سندھیوں کے خلاف خاک و خون کے خونیں ڈرامے کا ڈراپ سین کھیلا جا رہا ہے، اس کے اہم کرداروں میں جی ایم سید کی جئے سندھ تحریک کے علاوہ الذوالفقار تنظیم، لاکھوں ایرانی مسلح تخریب کار (جو غیر قانونی طور پر کراچی اور کوئٹہ میں خمینی انقلاب کے وقت سے مقیم ہیں۔ اور جس کی تصدیق ضیاء حکومت کے دور کے سینئر وزیر داخلہ جناب اسلم خٹک نے سینٹ میں اس موقع پر کیا جب کراچی اور کوئٹہ کی مسلم آبادی ایرانی تخریب کاروں کے راکٹ لانچروں کی گولیوں سے لہولہان ہو گئی تھی۔ لیکن ایرانی حکومت کی مداخلت سے ان تخریب کاروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جا سکی') گلگتی اور بلتستانی شیعہ، مقامی ہندو، بھارتی جاسوسی ادارہ "را" کے ایجنٹ، مقامی شیعہ عسکری تنظیمیں، مختار فورس، ال ملیشیا، امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور مہاجر شیعہ دانشور پیش پیش ہیں۔ جنہیں صوبہ کی انتظامیہ کی جو شیعہ گورنر، شیعہ وزیر اعلیٰ، شیعہ آئی جی، ڈی آئی جی اور صوبائی شیعہ وزراء کی اکثریت پر مشتمل ہے، کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ یہ رقص ابلیس گذشتہ ڈیڑھ سال سے مسلم شہریوں کے خلاف کھلے بندوں وفاقی حکومت کی ایماء اور ہدایت سے جاری و ساری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سندھ کو محب وطن شہریوں سے پاک کر کے ایک الگ اور آزاد سندھ کے منصوبے کو پایہ تکمیل تک بلا روک ٹوک پہنچایا جا سکے۔

شروع میں بھائی کو بھائی سے لڑانے کی روایتی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ نقاب پوش مسلح ایرانی، گلگتی اور بلتستانی کبھی پٹھان بستیوں پر، کبھی بہاری بستیوں پر اور کبھی مہاجر بستیوں پر رات گئے اندھیروں میں اندھا دھند فائرنگ کر کے یہ مشہور کرتے رہے کہ فائرنگ ان کے مخالف گروپ کی طرف سے کی گئی ہے۔ اس طرح عرصہ تک بہاری کو پٹھان اور مہاجر کو پنجابی کا دشمن بنائے رکھا گیا۔ یہی عمل شیعوں کے اسلاف نے ماضی میں مسلمانوں کے دو محترم و معزز گروہوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے فریقین پر شب خون مار کر کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں امت مسلمہ جنگ جمل کے المناک سانحہ سے دوچار ہوئی تھی۔ آج یہی شیطانی کھیل شیعہ پاکستان میں کھیل کر بھائی کو بھائی سے لڑوا رہے ہیں تاکہ دنیائے اسلام کا یہ قلعہ اور مسلم ممالک کے گرد جو حصار پاکستان نے قائم کر رکھا ہے وہ کسی طرح ٹوٹ جائے اور شیعہ ایران کو عرب ممالک کو لقمہ تر بنانے کا راستہ ہموار ہو سکے۔

گذشتہ ڈیڑھ سال سے ملک و قوم پر شیعہ حکومت کی شکل میں جو عذاب مسلط ہے اس سے نجات پانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم سب علاقائی، نسلی اور مذہبی فروعی اختلافات کو چھوڑ کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر یک جان دو قلب ہو جائیں۔ یہ طرفہ تماشا نہیں تو اور کیا ہے کہ شیعہ جو ماضی میں ۷۲ فرقوں میں بٹے ہوئے تھے، خمینی انقلاب کے بعد اپنے تمام تر اختلافات بھلا کر باہم شیر و شکر ہو گئے۔ جب کہ امت واحد نے خود کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر قرآن میں بیان کردہ عذاب الٰہی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ (الانعام۔ آیت ۵۶) باہمی نفاق و نفرت نے ہماری ہوا اکھاڑ دی۔ اور ہم اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اقلیت کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو گئے۔

{بشکریہ "ثالث" لاہور ۲۴ر جولائی ۱۹۹۰ء}

(بقیہ از صفحہ ۳)

کی۔ وہ ایسا بے تاب اور مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز اتنی پُر درد اور پُرسوز تھی کہ برصغیر اور عالم اسلام کے ہر سانحہ میں بے ساختہ بلند ہو جاتی تھی۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا اس درجے مؤثر تھی کہ ایک آن میں صورِ اسرافیل بن جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اسلام اور اہل اسلام کی ہر اذیت پر اشکبار ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی ہلکی سے ہلکی تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارا کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے۔ ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم و ستم کے شکنجے میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک و قوم کی مصیبت کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے۔

انہوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست ٹکر لی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے بڑا حریف گردانا۔ عراق، ایران، ترکی، نجد، حجاز، مصر، شام، بیت المقدس غرض ہر خطۂ ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

وہ مرد مجاہد اپنے دور کی تمام حریف طاقتوں سے عمر بھر پنجہ آزما رہا، کبھی کسی سے مات نہ کھائی اور کسی کے سامنے ایک لمحے کے لئے بھی سرنگوں نہ ہوا۔ لیکن عزرائیل کے مقابلے میں شکست کھا گیا اور فرشتۂ اجل نے موت کا پیغام دیا تو گردن جھکا لی۔

موت کی تمہید بھی بڑی طولانی تھی جو فالج، لقوہ اور یرقان کے انتہائی الجھے ہوئے عنوانات پر چار سال تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ بالآخر قمری حساب سے اکہتر اور شمسی حساب سے تقریباً ستر منزلیں طے کر کے ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ ہجری (۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء) کی شام کو چھ بج کر پچپن منٹ پر اس عالی مرتبت شخص کی کتابِ حیات کا آخری ورق ختم ہو گیا اور اللہ ذوالجلال کی طرف سے یہ مسرت انگیز ندا آئی۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

نرم گرم

ابو اسامہ

شہنشاہ بجٹ اور جون خون

بھائی صاحب - آپ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہیں - کیا ہوا ہے .... ؟ اور یہ آپ کی شکل پہ سکھوں کی طرح بارہ کیوں بج رہے ہیں ——— ؟ محترم مجھے تنگ نہ کریں اور اپنا راستہ ناپیں - جانے کیسے کیسے لوگ جی کے جلانے کو آجاتے ہیں - ہونہہ ..... آپ کو نظر نہیں آتا - اندھے ہیں آپ .... یہ میری شکل ہے یا وال کلاک (WALL CLOCK) جو آپ کو بارہ بجتے نظر آرہے ہیں - یہاں مہینے بھر سے بجٹ تقریر سن کر ابھی تک اپنے کان بج رہے ہیں - ریڈیو، ٹی وی پر تو وزیر خزانہ چند گھنٹے بج بجا کر چپ ہو گئے - اور یہ کان جو سارا سال بجتے رہیں گے، اگلے سال اس سے اگلے سال، سال بہ سال بجتے رہیں گے بجتے رہیں گے ..... شاید قبر تا حشر تک بجتے رہیں - جانے کیوں لوگ زخموں پر نمک چھڑکنے آجاتے ہیں، نمک شاید سستا ہے اس لئے .... حکومت کم از کم اسے بھی مہنگا کر دیتی - نہ مارکیٹ میں (AVAIL ABLE) ہوتا اور نہ یوں کوئی سستے داموں چھڑکتا -

اے میرے پیارے اللہ میاں! کیا ایسا ممکن ہے کہ تو سال کے بارہ مہینوں میں سے جون کو بالکل غائب کر دے - اسے دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دے بالکل ایسے جیسے تو نے شداد کی جنت نظروں سے اوجھل کر رکھی ہے - نہ ہر سال یہ مہینہ آئے گا اور نہ ہمارا خون ہوگا - یہ جون کے مہینے میں عوام کا جو خون ہوتا ہے - اس "جون خون" میں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ قبلہ کدھر ہے - طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کی سمتیں گڈمڈ ہونے لگتی ہیں - سر چکرانے لگتا ہے - دل ہولنے اور ڈولنے لگتا ہے اعضائے رئیسہ جواب دینے لگتے ہیں ..... بجٹ آرہا ہے بجٹ آرہا ہے ..... ایک ڈرا دینے والی آواز ایک اوسان خطا کر دینے والی گرج .... باادب، با ملاحظہ ہوشیار، نگاہ روبرو، شہنشاہ عالیشان، عزت مآب، شہنشاہ ہفت کشور، جہاں پناہ، عالی جاہ "بجٹ" تشریف لا رہے ہیں - (اور جب "شہنشاہ بجٹ" "جون" کی کرسی پر متمکن ہوتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ جون

کے علاوہ گیارہ مہینے اور بھی ہیں ۔ اور انسانوں کو بہر طور زندگی گزارنی ہے ۔ جون کی گرمی ان کے حواس چھین لیتی ہے وہ "جون" اور "خون" کے درمیان ایک نقطے کے فرق کو بھول کر لوٹنے چلے جاتے ہیں ۔ بالکل اس بچے کی طرح جسے بچپن میں استاد بطورِ سزا پوری کلاس میں کھڑا کر کے کتاب اس کے ہاتھ میں تھما کے کہتا ہے کہ .... پڑھو..... اور وہ بیچارہ سب کے درمیان سہما سہما کھڑا پڑھتا رہتا ہے ۔ اٹکتا رہتا ہے ۔ مجال ہے جنبش کر سکے ۔ کچھ اس پر ہنستے ہیں چند مسکراتے ہیں لیکن اسے بس حکم ہے "پڑھو"۔ ایسے ہی اسمبلی ہال میں تاریخ اپنے آپ کو دھراتی ہے ۔

اور آپ اس نقطے کو معمولی نہ سمجھیں کہ صاحب "جون" کے پہلو سے اٹھا کر اس کے سر پر سجایا تو "خون" ہو گیا ۔ مشہور مسیحی فلاسفر خلیل جبران خلیل ———— ایک جگہ لکھتا ہے کہ "کہتے ہیں سات صدیاں پہلے ایک وادی سے سات کبوتر اڑے ہر کبوتر کے پر کے نیچے سیاہ تل تھا، آج لوگ کہتے ہیں کہ سات صدیاں پہلے ایک وادی سے سات سیاہ کبوتر اڑے تھے" دیکھا آپ نے نقطے برابر تل نے کیا کام دکھایا..........

مان لیا ہر چیز مہنگی ہو گئی ، گوشت ، چینی ، آٹا ، دال ، ٹماٹر ، بھنڈی توری کریلا ، چائے کی پتی ، ٹائر ٹیوب ، پٹرول ، ڈیزل ، مٹی کا تیل ، پلاسٹک کے برتن ...... ہر چیز مہنگی ہو گئی لیکن انسان کا خون سستا ہو گیا ۔ سستا نہ ہوتا تو حیدر آباد ، پکا قلعہ اور کراچی میں یوں روانی سے نہ بہتا ثبوت ہو گیا کہ جہاں چند اشیاء کی قیمتیں چڑھی ہیں وہاں کچھ سستی بھی ہوئی ہیں ۔ اب آپ مانیں یا نہ مانیں ...... بہنے والا خون اتنا سستا تھا کہ پورے ملک سے کوئی سیاسی لیڈر ان کی دلجوئی اور اشک شوئی کے لئے نہیں گیا ...... گیا تو کون گیا ..... آخر وہی ساڑھے گیارہ سالہ آمریت کی چمکتی نشانی اعجاز الحق اور ہمایوں اختر .... انہوں نے سوچا خون اتنا سستا بھی نہیں کہ یونہی بہنے دیا جائے ۔ اشیائے خورد و نوش کا کیا ہے قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں .... آج یہ ہیں کل کوئی اور ہو گا وقت ایک سا نہیں رہتا اور پھر یہ بھی دیکھیں ناں اللہ نے ہر ذی روح سے رزق کا وعدہ کر رکھا ہے تو پھر پریشانی کا ہے کی ..... ؟ نہ سوچا کریں ۔ بس خوش رہا کریں ، جب رزاق وہ ہے تو پھر غم کیوں ...... ؟ گھبرائیں نہیں وہ دن دور نہیں جب ان شاء اللہ جون کے مہینے میں خون کی بجائے مون (MOON) ابھرے گا اور ٹھنڈی میٹھی میٹھی چاندنی ہو گی اور پھر نہ جون کی گرمی ہو گی نہ خون کی ارزانی .... تھوڑا انتظار اور ..... زمانہ کروٹ لینے کو ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بڑے چھوٹے تمام احراری ان کی زندگی میں بھی انہیں "شاہ جی" کہتے تھے، اب بھی شاہ جی کہتے ہیں۔ نہ کوئی شخص "شاہ صاحب" کہتا تھا اور نہ فرطِ احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے۔ جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے کہ اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ میرے مسلک کی رو سے "تقلید" جائز نہیں، لیکن میں اس سلسلے میں "مقلد" ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مقلد کسی امام فقہ کا نہیں، احراریوں کا......! جن کے نقطۂ نظر سے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر شاہ جی کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجبور ہوں کہ ان کی "تقلید کا قلادہ" اگر اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا تو قلم کی "گردن" میں ضرور ڈال دوں چنانچہ ان کی تقلید کرتے ہوئے، میں نے ہر جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ یا شاہ صاحب کی بجائے شاہ جی ہی لکھا ہے (اسحاق بھٹی)

فیروز پور شہر اور ضلعے میں مجلس احرار سے منسلک حضرات، تعداد میں اگرچہ کم تھے، لیکن اپنی اپنی جگہ خاص اثر و رسوخ کے مالک اور معاشرتی اعتبار سے باوقار مرتبے کے حامل تھے۔ شہر کی مجلس احرار میں مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خان، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، حکیم احمد علی، مہر محمد علی اور حاجی نظام الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجلس احرار سے میرا کبھی سیاسی تعلق نہیں رہا، لیکن ان سب حضرات سے میرے مراسم تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ عبدالعظیم خاں خانیوال میں، حاجی نظام الدین گوجرانوالہ میں، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ لاہور میں، حکیم احمد علی کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں اور مولانا عبیداللہ احرار (جو بعد میں پاکستان کی مجلس احرار کے صدر منتخب کئے گئے) فیصل آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ اب یہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور فقط ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں جو روح کو تڑپاتی اور دل کو غمگسار کرتی ہیں۔

جب تک یہ زندہ رہے، ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض کے جنازوں میں بھی بچشم اشک بار شرکت کی اور اس وقت ان کی یادوں نے قلب و ذہن کو شدید جھٹکے دیئے۔ ان میں سے بعض کے لڑکوں سے اب تک سلسلۂ روابط قائم ہے اور جب کسی سے کہیں ملاقات کا موقع ملتا ہے تو بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور بات شروع ہو جائے تو حافظے کی تہوں میں دبے ہوئے بے شمار واقعات اچھل اچھل کر نظر و بصر کے زاویوں میں آجاتے ہیں اور پھر زبان ان کے اظہار و بیان کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے۔ میرے وہ ہم نشین اور یاران محفل بے شک اس دنیا سے رختِ سفر باندھ گئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، مگر دل کی دنیا میں بدستور آباد ہیں۔ فیضی کا یہ شعر اس صورت حال کی پوری عکاسی کرتا ہے۔۔

ای ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید، ولی نہ از دلِ ما

کتنی ہی ایسی ہستیاں اس جہان فانی سے یکے بعد دیگرے کوچ کر گئیں، جن سے شب و روز کا تعلق تھا اور ان کی زندگی میں کبھی جدائی کا احساس تک نہیں ہوا تھا، خیال یہی تھا کہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا رہے گا۔ اب وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ہیں تو آنکھیں کھلی ہیں اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ اس بھری پُری اور جیتی جاگتی دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔۔۔

ز رفتنِ تو، من از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کر دی و من در وطن غریب شدم

فیروز پور کی مجلس احرار کے یہ چند افراد اس شہر کی جان تھے اور وہاں کی سیاسی اور سماجی رونقیں ان کے دم قدم سے پورے جوبن پر تھیں۔

شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر جانب مغرب ایک گاؤں 'جو تحصیل فیروز پور میں واقع تھا' "لکھوکے" کے نام سے موسوم تھا۔ اس گاؤں میں کئی پشتوں سے علم کا چرچا رہا تھا اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ اس میں ایک

وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے' جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالم وجود میں آئے تھے۔

بزرگ مولانا محمد علی لکھوی فروکش تھے' جو حضرت حافظ محمد لکھوی (صاحب تصانیف کثیرہ) کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے فرزند ارجمند تھے۔ یہ مجاہدانہ فطرت کے مالک اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے' جہاد کے لئے بھی بہت سے لوگوں کو وہاں بھیجا' مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ موجودہ نسل کے لوگوں سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جا سکتا ہے کہ یہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا معین الدین لکھوی اور مولانا محی الدین لکھوی کے والد گرامی قدر تھے۔

مولانا محمد علی لکھوی جلیل القدر عالم اور بڑی فعال و متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے انگریزی حکومت کی مخالفت کے لئے ایک باقاعدہ تربیت گاہ قائم کر رکھی تھی' جس میں دینی و دنیوی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جہاد کی مشق و تمرین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ تربیت گاہ "لکھوکے" سے ڈھائی میل کے فاصلے' پر ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ' دو مربع زمین میں قائم کی گئی تھی اور اس کا نام انہوں نے "مرکز الاسلام" رکھا تھا۔

مولانا محمد علی کا مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت تو نہ تھا' البتہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے اکابرو اعیان سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ پھر ان کا بہت بڑا حلقہ ارادت اور دائرہ متاثرین بھی تھا۔ انہیں اس نظام ملک میں رہتا پسند نہ آیا تو ۱۹۳۰ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں مسجد نبویؐ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ چند سال بعد واپس وطن آئے تو ۱۹۳۸ء میں پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ آئے جہاں قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اس عالم اجل نے اکتوبر ۱۹۷۴ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کے بعد مرکز الاسلام کی تربیت گاہ کے انتظام کی ذمے داریاں ان کے دونوں صاحبزادوں..... مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی ..... نے سنبھال لی تھیں۔ اب وہاں مجاہدین کی تیاری کا سلسلہ تو ختم ہو گیا تھا' البتہ مدرسہ باقاعدہ قائم رہا' جس میں قدیم و جدید علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میں وہاں یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے آخر سال تک طالب علم کی حیثیت سے اور مارچ ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک معلم کی حیثیت سے مقیم رہا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکز الاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال کی مئی کے پہلے ہفتے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما..... مولانا عبیداللہ احرار' خان عبدالعظیم خاں اور حکیم احمد علی..... مولانا محمد علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہم نے فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے' آپ سے درخواست ہے کہ اس ضمن میں رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات و دیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔ مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محی الدین لکھوی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں' انہیں جلسے کی تشہیر کے لئے دو تین پنجابی نظمیں لکھنے کا حکم دیا اور طلبا کی دو ٹولیاں بنا دی گئیں۔ ایک کا قائد محی الدین کو اور ایک کا معین الدین کو مقرر کیا گیا۔ سب کے لئے لال رنگ کی ایک ایک قمیص سلا دی گئی۔ مئی کا مہینہ' سخت گرمی کا موسم' ہم نے لال رنگ کی قمیصیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں

پیدل جاتے، اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح ہم ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے، عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑے ہو کر اور مرد باہر نکل کر ہمیں دیکھتے۔ بچے ہمارے ساتھ چل پڑتے، جس گاؤں میں دوپہر ہو جاتی، وہاں کی مسجد میں چلے جاتے، لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر

اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضا کاروں کی طرح سرخ قمیص پہنے، ایک بڑے جلوس کی شکل میں ہم فیروز پور پہنچے اور نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے، جلسے کے وسیع میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی لکھوی اسی لباس میں تھے، وہ روزانہ پہنتے تھے۔ یعنی سفید کھدر کی قمیص، کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا

جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے کہ اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں

ہمیں کھلاتے اور لسی پانی پلاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کر لیا جاتا۔ جس گاؤں میں رات پڑتی، وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے۔ عشاء کے بعد مسجد میں مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے ہنجابی نظم پڑھی جاتی اور پھر ہمارا قائد تقریر کرتا۔ صبح کو لسی پانی کے بعد پھر سلسلۂ سفر شروع ہو جاتا۔

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کئے جاتے، انگریز دشمنی کی یاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جو تکلیفیں دی گئیں یاد دی جا رہی تھیں، ان کی وضاحت کی جاتی۔ اس طرح کچھ عرصہ ہم نے مجلس احرار اور اس کے قائدین و رہنماؤں کے فضائل و مناقب کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں کبھی یہ واقعہ ذہن میں آتا ہے تو حیال کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی تھی۔ جہاں ہم جاتے، لوگ بے حد متاثر ہوتے اور پورے غور سے بات سنتے۔ ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کرتے اور جلسے میں شرکت کا وعدہ بھی کرتے۔ پندرہ میں روز کے بعد دو چار روز کے لئے ہم مرکز الاسلام آتے اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ مولانا محمد علی لکھوی کو پیش کرتے تو وہ نہایت خوشی کا اظہار فرماتے اور ہماری حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ انتہائی زندہ دل اور بے حد خوش مزاج عالم دین تھے۔ ہر لڑکے سے الگ الگ اس کی کارکردگی کے بارے میں پوچھتے اور اپنے انداز خاص سے اس کی تعریف فرماتے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

تہ بند۔ ہر ضلعے کے لئے الگ الگ کیمپ لگائے گئے تھے۔ ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضا کار سرخ قمیص کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی چھوٹی سی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے مگر ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیص پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

پروگرام کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوتا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ کسی نے آواز دی وہ دیکھو شاہ جی گھوم رہے ہیں۔ میں دوڑ کر آیا اور انتہائی شوق اور مسرت کے ساتھ شاہ جی کو دیکھا۔ پورا قد، گٹھا ہوا جسم، سرخ و سفید رنگ، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، جو ان کی ذہانت کی غماز تھیں، سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوب صورتی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیص، سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی، جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے، پاؤں میں پشاوری چپل۔ ہاتھ میں کلہاڑی، جس کا دستہ ان کی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی مخنوں سے ذرا اونچی شلوار.....! وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آ نکلے۔ وہ مصافحے کے لئے ان کی طرف بڑھے، وہ بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغل گیر ہو گئے۔ پھر گرم جوشی سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر خیریت پوچھی۔ اس موقعے پر مولانا مظہر علی اظہر، صاحب زادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ بھی کامل احترام اور تپاک سے مولانا لکھوی سے ملے۔ اس کے

بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں پنڈال میں داخل ہو گئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولیں موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ اندوز ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک مردانہ حسن کے تمام اوصاف سے متصف تھے اور اپنے اندر انتہائی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آج یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کی شب کو جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، اس واقعہ پر آدھی صدی سے اوپر (یعنی اکیاون برس ڈیڑھ مہینے کا) طویل عرصہ بیت چکا ہے، مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل و نہار کی بے شمار کروٹوں کے

بیٹھے ہوئے تمام اکابر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ سٹیج اتنا اونچا تھا کہ چار یا پانچ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اوپر جانا پڑتا تھا۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر، جو خاص طور سے ان کے لئے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔ میرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ تقریر کے لئے مائک پر آئے اور پھر نعرے بلند ہونے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک انداز خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائک کو ذرا اپنے قریب کیا اور خطبۂ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے کانوں سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دلکش اور رسیلی آواز۔ خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیر و بم ہم آہنگ ہوتا تھا تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور

جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔

باوجود حافظے نے ان کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے۔

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ ناز اک جنبش ترے ابرو میں تھی

مجلس احرار کے فیروز پور کے اس جلسے میں ہزاروں افراد کا جمع تھا۔ شہر اور ضلع کے قصبات و دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آئے تھے۔ شہر سے جانب مغرب، پانچ میل کے فاصلے پر، دریائے ستلج کا حسینی والا ہیڈ عبور کرتے ہی لاہور کا ضلع شروع ہو جاتا تھا جو اب ضلع قصور کہلاتا ہے، اس سے بہت سے لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے اور وسیع پنڈال میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

شاہ جی عشاء کی نماز سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد چند لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے، 'امیر شریعت زندہ باد' مجلس احرار زندہ باد اور نعرۂ تکبیر سے فضا گونجنے لگی۔ سٹیج پر

اللّٰھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوئے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پنہاں تھا۔ اس وقت عقیدت و انکسار کے تمام لوازم ان کی ذات اور زبان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں.....

سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل شخص اب کہاں پیدا ہو گا۔

ان کی تقریر متعدد مسائل پر مشتمل تھی۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں کہ انہوں نے تقریر میں کیا کہا، البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف خوب برسے، مرزائیت کی تردید کی، مسئلہ توحید کی وضاحت فرمائی اور قرآن کی بہت سی آیات تلاوت کیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ اس زمانے میں مجلس احرار نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا، شاہ جی نے اسے بھی منقح کیا۔ کئی گھنٹے تقریر جاری رہی۔ ادھر موذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا، ادھر مقرر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہو گئی۔

اس سے تقریباً تیرہ مہینے بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں دلّی میں

میں نے دیکھا کہ شاہ جی ننگے سر تھے ' نہ سر پر ٹوپی تھی ' نہ کپڑا۔ ان کے سفید گھنگھریالے بال عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سنا ہے کہ شاہ جی نے اس وقت سے ٹوپی اتار دی تھی ' جب انہیں پتہ چلا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا سید حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا ' جب مولانا مدنی صوبہ سرحد کے دورے سے بذریعہ ٹرین دیوبند جا رہے تھے۔ جب ٹرین جالندھر اسٹیشن پر پہنچی تو چند مسلم لیگی نوجوان اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں وہاں آئے۔ مولانا کو برا بھلا کہا ' ان کی پگڑی اتار لی ' طمانچہ مارا ' اور گالیاں دیں۔ شاہ جی اس کے بعد امرتسر کے ایک جلسے میں پہلی مرتبہ ننگے سر آئے اور فرمایا! جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے ' میں نے عہد کیا ہے آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا۔

آغا شورش کاشمیری نے اس حادثے کے متعلق اپنی کتاب "بوئے گل ' نالۂ دل ' دودِ چراغ محفل" (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) کے صفحہ ۲۷۶ کے حاشیئے میں لکھا ہے۔ "ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پرجوش کارکن تھے۔ حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے۔ ان کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامے کا کریڈٹ لے کر مولانا عظامی کے ہاں پہنچا۔ وہ ان دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے۔ مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے۔ بار بار پوچھتے واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے ' اس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آ کر قتل ہو گیا۔ اس کی نعش تک نہ ملی ' بلکہ معمّا ہی رہا۔ اس کا دوسرا ساتھی مہاجرت کے وقت دریائے بیاس میں ڈوب گیا"۔

شاہ جی کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ جن حضرات کو دلی جانے اور اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا ہے ' اور وہاں کی جامع مسجد بھی دیکھی ہے ' میں ان کو یہاں جلسے کا محل وقوع بتانے کی کوشش کروں گا۔

دلی کی جامع مسجد (جسے شاہ جہانی مسجد بھی کہا جاتا ہے) کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اسی میدان میں ہرے بھرے کا مزار ہے اور یہیں مولانا شوکت علی کا مدفن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر ہے۔ میدان کے اختتام پر لال قلعے کا دروازہ ہے اور یہ وہی قلعہ ہے جو مغل شہنشاہ شاہ جہان نے تعمیر کیا تھا۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ایک خاصی چوڑی سڑک ہے ' جس پر بے شمار گاڑیاں چلتی ہیں جو لوگوں کو مختلف مقامات میں پہنچاتی ہیں۔ جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے۔ میں دلی میں شاہ جی کے جس جلسے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ' اس کا سٹیج اردو بازار کے قریب تھا اور بازار مقرر کی پشت کی جانب تھا۔ ان کی بائیں جانب جامع مسجد اور دائیں جانب لال قلعہ تھا۔ ان کے سامنے وسیع میدان میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ یہ جلسہ جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی۔ تقریر میں سیاسیات بھی تھیں اور مذہبیات بھی! لوگ اس طرح خاموش اور ہمہ تن گوش تھے جیسے کان علیٰ رؤسہم الطیر کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں ' جوں ہی سر ہلا اور پرندے اڑے...... شاہ جی کہہ رہے تھے۔ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے ملک کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لئے عمل و حرکت کے میدان میں اترنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مطالبۂ آزادی کے مقابلے میں یہ پکڑ دھکڑ ' یہ قید و بند ' یہ سزائیں ' یہ پھانسیاں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے آزادی سب چیزوں سے عزیز ہے۔ دلی والو......! جس

اُدھر مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا

اِدھر مقرّر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہو گئی

صورت میں بھی آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے دونوں ہاتھ ملا کر اور ہتھیلیاں اس انداز سے حاضرین کی طرف بڑھا کر جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں، پنجابی کا یہ شعر پڑھا۔

شاہ جی نے کہا کہ میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں، واہ شاہ جی واہ۔! جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ۔! میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

جے ہیر سمندروں پار ہووے
ٹکاں نال سمندرنوں چھٹ شاں

تو مجمعے کے سکوت کا مضبوط بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین کے انداز میں اچھلنے اور سر ہلانے لگے۔ جبہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام بھی تڑپ اٹھے۔ واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور "امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد"! کے نعرے گونجنے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت ہی کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنی سمجھے ہوں گے، مگر شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اسے عملی شکل میں ڈھالا، اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کا مطلب بالکل واضح کر دیا تھا۔

سامعین کی زبانوں سے "واہ واہ" کا لفظ سن کر شاہ جی نے کہا کہ میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں، واہ شاہ جی واہ۔ جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ۔! میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو ستمبر ۱۹۴۵ء تک چھ سال جاری رہی۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کی پاداش میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے زعماء و قائدین کو گرفتار کر کے حکومت نے ملک کے مختلف جیل خانوں اور قلعوں میں بند کر دیا تھا۔ چھ سال کی قید کے بعد انہیں رہا کیا گیا تو برطانیہ کی توپ و تفنگ کی جنگ جیتنے والی حکمران جماعت کنزرویٹو پارٹی اپنے ملک میں ووٹ کی جنگ ہار چکی اور لیبر پارٹی برسراقتدار آ چکی تھی، جس کے وزیراعظم مسٹر اٹیلی تھے۔ انہوں نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کیلئے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا۔ اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا ہے۔

یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام (ضلع فیروزپور) میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور عمر کی بیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کل رات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لا رہے ہیں اور وہاں وہ جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔ میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے قصور جانے اور شاہ جی کی تقریر سننے کا پروگرام بنایا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

ہم قصور پہنچے تو فیروزپور اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ مل گئے جو شاہ جی کی تقریر سننے آئے تھے۔ طویل عرصے کے بعد شاہ جی اس نواح میں تشریف لائے تھے۔ شب نو بجے کے بعد ان کی تقریر شروع ہوئی اور چار گھنٹے جاری رہی۔ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ملک میں انتخابات کے ہنگاموں کے دن تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے وہاں کے دیہاتی حلقے میں میاں افتخار الدین انتخاب لڑ رہے تھے جو کچھ عرصہ پہلے کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر میں انگریزی حکومت کی نہایت سخت لب و لہجے میں مخالفت کی اور عالم اسلام اور ہندوستان پر اس کے بے پناہ مظالم تفصیل سے بیان کئے، مسلم لیگ کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور اس کے سیاسی نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دور تک پھیلا ہوا انسانوں کا یہ ہجوم شاہ جی کی مٹھی میں ہے اور ان کی پُرجوش خطابت نے ان کو پوری طرح مسحور کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض جماعتوں کے قائدین کی عملی حالت کو بھی موضوع بحث بنایا اور اسلام سے متعلق ان کے قول و فعل کے تضادات کا جائزہ لیا۔ پھر اسلامی تعلیمات کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔

شاہ جی جیسا بے خوف، مسلسل کئی کئی گھنٹے بولنے والا، اپنے نقطۂ فکر کے اظہار میں مخلص اور زوردار خطیب برصغیر نے پیدا نہیں کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو شاہ جی دلی گئے اور ایک رات جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ دوران تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو، کیبنٹ مشن کے ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس کو وہاں لے گئے۔ کرپس چند منٹ جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ وہ ان کی تقریر تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اسلوبِ بیان سے متاثر ہو کر اس نے جواہر لال سے کہا کہ جس ملک میں اس قسم کے سیاسی مقرر اور خطیب ہوں، وہ ملک آخر کب تک غلام رہ سکتا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا مقرر ہے اور شکل و صورت سے "فادر" معلوم ہوتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نقشۂ عالم پر ابھر آیا۔ ہم لوگ اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ، حال ضلع فرید کوٹ مشرقی پنجاب) کی سکونت ترک کر کے چک نمبر ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئے۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا، اسی سال کے آخر یا ۱۹۴۸ء میں لائل پور میں مجلس احرار کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کا اہتمام مولانا تاج محمود، مولانا عبید اللہ احرار (جو فیروز پور سے لائل پور جا بسے تھے) اور ان کے دیگر احرار دوستوں نے کیا تھا۔ میرے گاؤں کے بہت سے لوگ جلسہ سننے گئے، میں بھی گیا۔ رات کو اس جلسے میں شاہ جی نے بھی تقریر کی اور شورش کاشمیری نے بھی۔ شورش نے اس زمانے میں ہفت روزہ "چٹان" جاری کر رکھا تھا اور وہ مجلسِ احرار سے الگ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور زعماء احرار نے بھی تقریریں کیں، لیکن سب مقرروں کی تقریریں ڈھیلی تھیں اور لہجے مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ، وہ جوش اور وہ تند و تیز اسلوب جو احرار مقرروں کا خاصہ تھا، مفقود تھا۔

کوئی زمانہ تھا کہ لاہور میں یا کسی اور جگہ اعلان ہوتا کہ شاہ جی رات کو دس بجے تقریر کریں گے تو لوگ پانچ بجے ہی رات کا کھانا پانی لے کر جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے اور فجر کی اذان تک بیٹھے ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے رہتے۔ مگر لائل پور کے اس جلسے میں ہم نے دیکھا کہ شاہ جی کی تقریر بھی سامعین کے دلوں میں گرمی نہ پیدا کر سکی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لئے ایک مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) بنائی گئی تھی، جس کا صدر مولانا سید ابو الحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ مولانا داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجلس عمل کے تمام ارکان (مولانا داؤد غزنوی کے سوا) گرفتار کر لئے گئے تھے اور لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ اس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد اعظم خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مارشل لاء تھا جس سے پاکستان کے لوگ آشنا ہوئے۔ اس کے بعد مارشل لاؤں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اعتبار سے لاہور کے مارشل لاء کو آئندہ مارشل لاؤں کی ریہرسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں ان دنوں اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور مولانا غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ مجلسِ عمل کی چند میٹنگیں مرکزی جمعیت کے دفتر میں بھی ہوئیں، جن میں مجھے بھی شمولیت کا موقع ملا اور میں نے ان سب حضرات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گرفتاریوں تک نوبت پہنچے تو مولانا غزنوی گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں تاکہ تحریک کی رفتار بند نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں عمل و حرکت کا سلسلہ جاری رہے۔

جن بزرگوں کو حکومت نے ابتداء ہی میں گرفتار کر لیا تھا، ان میں شاہ جی بھی شامل تھے اور یہ سب حضرات سنٹرل جیل لاہور میں محبوس تھے۔ کئی سال ہوئے اس جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔ جسے شادمان کالونی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے مارچ کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا داؤد غزنوی نے ان حضرات سے جیل میں ملاقات کا پروگرام بنایا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مزنگ چونگی سے گلبرگ کو جاتے ہوئے شادمان چوک پہنچیں تو بائیں جانب نکڑ پر ایک مسجد ہے جو پہلے چھوٹی سی مسجد تھی، اب کافی وسیع ہو چکی ہے۔ اس کے بالکل سامنے سڑک سے دوسری طرف سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی تھی، جس میں انگریزی عہد کی ہیبت کے تمام عناصر نمایاں تھے۔ قاعدے کے مطابق سنتری بندوق کندھوں پر رکھے ہر آن وہاں کھڑا رہتا تھا۔ مولانا غزنوی کی آخری سیاسی قید نے تین سال (۵ اگست ۱۹۴۲ء سے ستمبر ۱۹۴۵ء تک) اسی جیل میں گزرے تھے۔ مولانا نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیل کے ایک ملازم کے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجا۔ وہ فوراً باہر آئے، مولانا کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں

بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولانا کے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مولانا ابو الحسنات شیخ حسام الدین اور شاہ جی کو وہیں بلا لیا اور گفتگو کے لئے الگ کمرہ دے دیا گیا۔ مولانا غزنوی نے ان حضرات کو جیل سے باہر کی صورتحال سے آگاہ کیا اور جس رفتار سے تحریک چل رہی تھی اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اس کی تفصیل بتائی۔

اب شاہ جی بوڑھے ہو چکے تھے اور جسمانی کمزوری کے آثار ان کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کا دل جواں تھا۔ جذبات کی دنیا پوری طرح آباد تھی اور کلمۂ حق کہنے کا داعیہ جوبن پر تھا۔ انہوں نے مولانا سے فرمایا، آپ ہماری کوئی فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لئے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔ ہمیں یہاں کامل اطمینان اور سکون حاصل ہے۔ آپ ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے اور تحریک جاری رکھئے۔ خود کوئی ایسا قدم نہ اٹھایئے، جس سے گرفتاری تک نوبت پہنچ جائے اگر ایسا ہوا تو تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے ملاقات رہی اور ہم واپس آ گئے۔

جب تک تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں گرفتار ہونے والے حضرات لاہور سنٹرل جیل میں محبوس رہے، مولانا غزنوی کئی مرتبہ ان سے ملاقات کیلئے گئے۔ میں ان کے ساتھ صرف دو مرتبہ گیا۔ بعد میں شاہ جی کو سکھر جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔

تحریک میں حصہ لینے والے لوگوں پر حکومت نے بے پناہ سختیاں کی تھیں، اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا تھا اور مجلسِ احرار خلافِ قانون قرار دے دی گئی تھی۔ پھر ایک تحقیقاتی عدالت قائم کر دی گئی تھی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تھی۔ عدالت لاہور ہائیکورٹ میں قائم کی گئی تھی اور تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات قلم بند کئے گئے تھے، جنہیں

اور یہ سب حضرات سنٹرل جیل لاہور میں محبوس تھے۔ کئی سال ہوئے اس جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔

جیل سے پولیس کی تحویل میں لایا جاتا تھا۔ تحریک کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی وکیل تھے۔ کمرۂ عدالت لوگوں سے بھر جاتا تھا اور سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے اکثر وکلاء کارروائی سننے کیلئے آتے تھے۔ مرزائیوں کی طرف سے بھی وکیل مقرر تھے۔ شاہ جی کو بیان دینے کیلئے جس دن عدالت میں طلب کیا گیا تھا، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم وہاں جمع تھا اور تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔

شاہ جی کو جب لایا گیا ان کے آگے پیچھے پولیس کے اہلکار تھے۔ وہ کمرہ عدالت میں آئے تو شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر ننگا تھا (پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اتاری گئی ہے، انہوں نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی) شاہ جی نے اپنے بیان میں مرزائیت کے پس منظر کی وضاحت کی اور پھر تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے، وہ شریعتِ اسلامی کی رو سے دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جو لوگ اس کو نبی مانیں اور اس کے بارے میں ظلی و بروزی کے چکر میں پڑیں، یا اس کی مدافعت کریں یا حامیانِ تحفظِ نبوت کو صرف اس وجہ سے مبتلائے اذیت کریں کہ وہ مرزا غلام احمد اور اس کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، میں صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہیں۔ شاہ جی نے نہایت جرأت مندانہ انداز میں کہا، جب تک میں زندہ ہوں یہ اعلان کرتا رہوں گا اور یہ اعلان کرنا اور اس پر قائم رہنا میری زندگی کا ایسا مشن ہے، جس سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔ جو شخص مجھے اس سے روکنے کی کوشش کرے گا، میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا اور میں اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

شاہ جی کا بیان کافی دیر جاری رہا اور درمیان میں بعض لوگوں نے نعرے لگائے تو عدالت نے نعرے لگانے سے روک

دیا۔ خود شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے، تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے اگرچہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو..... بیان کے بعد عدالت نے حکم دیا کہ جب تک تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے رہنماؤں کے بیانات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل ہی میں رکھا جائے۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر عدالت کو ان کی ضرورت پڑے۔

۲۵، ۲۶ر فروری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں دلی دروازے کے باہر تحفظِ ختمِ نبوت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں بعد دوپہر شاہ جی نے تقریر کی۔ جیل سے رہائی کے بعد لاہور میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی، جو تین گھنٹے جاری رہی بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے عقیدہ ختمِ نبوت اور تحریک تحفظِ ختمِ نبوت کی وضاحت کی لیکن اب ضعف و نقاہت نے ان کو گھیر لیا تھا۔ وہ مسلسل تیس برس تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالتے رہے تھے، مگر اب ان میں وہ کس بل نہ رہے تھے۔ نہ اب برطانوی حکومت ان کی حریف تھی، جس کی ستم گری کے بوقلموں واقعات سے ان کو پُرتاثیر جملوں اور نوع بنوع فقروں کا ذخیرہ عطا ہوتا تھا۔ نہ کوئی اور سیاسی طاقت ان کے مدِمقابل رہی تھی۔ جس پر تنقید کرتے ہوئے وہ نئے سے اسلوبِ کلام اور موثر ترین اندازِ بیان سے حاضرین کو تڑپاتے اور گرماتے تھے۔ اب ان کا لہجہ مرجھا چکا تھا اور جوشِ خطابت ماند پڑ گیا تھا۔

اس تقریر میں شاہ جی نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں بھی بعض باتیں ارشاد فرمائیں۔ یہ کسی خاص تاثر کی بناء پر ایک بڑے آدمی کا ایک بڑے آدمی اور اپنے پرانے ساتھی کے بارے میں اظہارِ خیال تھا۔

جلسہ گاہ میں میں نے دیکھا کہ چند نوجوان چار پانچ کتابچے سے تقسیم کر رہے ہیں۔ ان میں ایک نوجوان میرے پاس بھی آیا اور کتابچے دے کر نکل گیا۔ میں نے دیکھے تو دو کتابچے میرے ہی دو اداریوں پر مشتمل تھے جو میں نے "الاعتصام" میں لکھے تھے۔ سولہ سولہ صفحات کے یہ کتابچے میرے نام سے چھپے تھے اور مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت ملتان نے شائع کئے تھے۔

اس کی مناسب تفصیل تو انشاء اللہ اس مضمون میں بیان کی جائے گی۔ جو میں کسی وقت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لکھنا چاہتا ہوں، لیکن یہاں مختصر الفاظ میں عرض کر دوں کہ ۱۵ر مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی مرحوم نے برکت علی ہال (لاہور) میں جمعیت حدیث کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں ایسے الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو اہل علم کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے "الاعتصام" میں (جس کا میں اس زمانے میں ایڈیٹر تھا) اس کا نوٹس لیا تو جماعت اسلامی کے حلقوں میں شدید ردِعمل ہوا اور اس کے تمام رسائل و جرائد میدان میں نکل آئے۔ طرفین میں ایک صحافتی "جنگ" شروع ہو گئی اور پھر یہ جنگ اسی ایک محاذ میں محدود نہ رہی بلکہ اپنی فطرت کے مطابق بہت سے محاذوں میں پھیل گئی اور متعدد حضرات نے اس میں حصہ لیا۔ ۱۷ر جون ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی نے سرگودھا میں تقریر کی تو اس میں بھی بعض عجیب و غریب باتیں ارشاد فرمائیں۔ میں نے اس سے "الاعتصام" کی دو اشاعتوں..... ۱۵ر جولائی اور ۲۲ر جولائی ۱۹۵۵ء..... میں اظہارِ اختلاف کیا۔ عنوان تھا "لاہور کے بعد سرگودھا۔ راہ اعتدال یا راہ اعتزال"۔ مجلس تحفظ ختمِ نبوت ملتان نے ایک کتابچے کی صورت میں اسے "راہِ اعتدال یا راہِ اعتزال" کے نام سے شائع کیا۔

مولانا مودودی نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء میں) بعض تعجب انگیز باتیں تحریر فرمائی تھیں۔ میں نے "الاعتصام" کے ۴ر نومبر اور ۱۱ر نومبر ۱۹۵۵ء کے اداریوں میں "حصہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" کے عنوان سے اس کے بارے میں لکھا۔ اسے بھی کتابچے کی شکل میں مجلس تحفظ ختمِ نبوت ملتان نے شائع کیا۔ ان دونوں کی اشاعت کا علم مجھے اسی جلسے میں ہوا۔ جو ۲۵، ۲۶ر فروری ۱۹۵۶ء کو دلی دروازے کے باہر لاہور میں ہوا تھا اور جس کے آخری اجلاس میں شاہ جی نے تقریر کی تھی۔

۱۹۵۶ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں شاہ جی لاہور ہی میں تھے اور مجلس احرار کے دفتر (بیرون دلی دروازہ) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن دس بجے کے قریب مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی دفتر "الاعتصام" تشریف لائے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ میں اس وقت مولانا کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں بعض معاملات سے متعلق کچھ لوگوں نے شاہ جی

اور مولانا غزنوی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا ذکر شاہ جی نے چند روز پیشتر اپنے خاص انداز میں ۲۶ر فروری کی تقریر میں کیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے رفیق کار سے اس کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لئے انہیں شاہ جی سے دوستانہ شکوہ تھا۔ مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی چاہتے تھے کہ مولانا تھوڑی سی تکلیف فرمائیں اور شاہ جی کے پاس تشریف لے جائیں تاکہ باہمی گفتگو سے غلط فہمیاں دور ہو جائیں مگر مولانا اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ پہل شاہ جی کی طرف سے ہوئی ہے، از راہِ کرم وہ تشریف لائیں اور اپنا نقطۂ نظر واضح فرمائیں۔ میں بھی انہیں اپنا موقف بتاؤں گا۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو صاف لفظوں میں معافی مانگ لوں گا۔

> مولانا نے فرمایا، آپ ہماری کوئی فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لئے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔

کافی دیر گفتگو ہوتی رہی، بالآخر مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے ایڈیٹر (یعنی اس راقم عاجز) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ ان سے میرے موقف کی وضاحت کریں گے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ان دونوں صاحبان نے یہ تجویز منظور فرمائی اور میں مولانا کی نمائندگی کیلئے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے کی بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اسی بلڈنگ میں احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل میں گئے تو ایک بڑے کمرے میں موٹے بان کی چھوٹی سی چارپائی پر برصغیر کا شہنشاہِ خطابت آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرش پر ایک بڑی سی دری بچھی ہوئی تھی، جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ خاموش زبان سے اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروانِ احرار گزر چکے ہیں۔

دری پر سات آٹھ آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے اور شاہ جی نظر کی عینک لگائے اور ہڈیوں کا ڈھانچا بنے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور نگاہیں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم تینوں ان کے انہماک کو دیکھ کر "سرہانے میر کے آہستہ بولو" کی عملی تصویر بنے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے اور جوتے اتار کر اور بزبانِ خفی السلام علیکم کہہ کر نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شاہ جی نے کاغذ سے نگاہ اٹھائی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مودبانہ اور نیازمندانہ سلام عرض کیا اور گردن جھکا کر دونوں ہاتھ ان کے بابرکت ہاتھوں میں دے دیے۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر میرا تعارف کرایا۔

ان پاک طینت لوگوں کو ہمیشہ کے لئے دھرتی نگل گئی ہے اور اس کینڈے کے لوگ اب کبھی سطحِ ارض پر نمودار نہیں ہوں گے۔ افسوس ہے۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میرا نام (جو صحیح معنوں میں گم نام ہے) سنتے ہی بیسویں صدی کے برصغیر کا خطیبِ اعظم چارپائی سے اٹھا اور مجھے اپنی

> شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے، تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے۔

بغل میں لے لیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی سے کہا، تم خاموشی سے آکر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا، میں اپنے عزیز کو لینے کے لئے دروازے پر جاتا۔ اپنے برابر مجھے چارپائی پر بٹھایا۔ عجیب تر بات یہ کہ اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا اور جو بڑا سا تکیہ چارپائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لئے عنایت فرمایا۔ میں اس پیکر شفقت کی یہ پُرخلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو سرہانے کی طرف کسی نہ کسی طرح بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی میں آگیا کہ اب تعمیلِ ارشاد ہو گئی اور الامر فوق الادب پر عمل کر لیا گیا ہے۔

شاہ جی نے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں آپ کے اخبار "الاعتصام" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں، آپ کے اداریئے پڑھتا ہوں اور خوش ہو کر آپ کو دعا دیتا ہوں۔ آپ کے دو اداریئے تو میں نے مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت ملتان کی طرف سے کتابی صورت میں شائع بھی کرائے ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان "راہِ اعتدال یا راہِ اعتزال" اور ایک کا "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" ہے۔ پھر یہ دو کتابچے مجھے عطا فرمائے۔

اس کے بعد انہیں مولانا داؤد غزنوی کا سلام پہنچایا گیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کہا کہ مولانا سے بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے، میرے متعلق بتایا کہ یہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے بات کریں گے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے شاہ جی کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل رہا...... تمام گفتگو میں انہوں نے یا تو مجھے اسحاق صاحب کہہ کر خطاب فرمایا یا میرے عزیز کہہ کر......! جمال و انکسار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا میں فقیر آدمی ہوں۔ مولانا داؤد غزنوی سے خفا ہونے اور ان سے گلے شکوے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھا زندگی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے تھوڑے سے علم کے مطابق وعظ و نصیحت کی خدمات انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ داؤد غزنوی مجھے جانتے تھے اور میرے طریقِ وعظ کا انہیں علم تھا۔ میں نہایت سادگی سے رہتا اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند باندھتا تھا۔ ان کا گھرانہ فضل و کمال اور تصوف و طریقت کا گھرانہ تھا، جس کے فیوض کا دائرہ سارے پنجاب پر محیط تھا۔ ان سے ملاقات ہوتی تو نہایت مہربانی کا اظہار کرتے، میں بھی جھک کر سلام کرتا۔ ان کی بھی جوانی کا زمانہ تھا، میں بھی جوان تھا۔ لیکن ان کا شمار اس دور کی مجلس خلافت کے قائدین میں ہوتا تھا اور میں گوشہ نشین امام مسجد تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کیوں مسجد میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ اٹھو میدانِ عمل میں نکلو، ملک و قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں ان کے کہنے سے مسجد کی چار دیواری سے باہر نکل آیا اور تحریکِ خلافت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میانوالی جیل میں ہم دونوں اکٹھے رہے اور بارہا جیل اور ریل میں ہماری رفاقت رہی۔ تحریکِ خلافت میں، جمعیت علمائے ہند میں (جس کے بانیوں میں خود داؤد غزنوی کا نام بھی شامل ہے) مجلس احرار میں اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا، ایک سٹیج پر تقریریں کیں اور بے شمار مواقع پر ہم سفر رہے۔

شاہ جی نے فرمایا میں سیاست میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور استاد کا گلہ کرنا اس فقیر کا شیوہ نہیں۔ میری جوانی گزر گئی، کہولت کا زمانہ بیت گیا، اب بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میں ہرگز اس سیدزادے سے خفا نہیں یہ میرا اللہ اللہ کرنے کا وقت ہے، گلے شکوے کی کتاب کھول کر بیٹھنے کا نہیں۔ اسحاق صاحب! میرا انہیں نیازمندانہ سلام پہنچایئے اور میری طرف سے عرض کیجئے کہ وہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں، مجھ گنہگار کے لئے دعا کریں۔ میں بھی ان کے لئے دعاگو ہوں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس فقیر کے پاس آنے کی زحمت گوارا کی۔

شاہ جی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ ان کا لہجہ انتہائی نرم اور طرزِ کلام بدرجہ غایت میٹھا اور پیارا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے اور زبان کے طرز ادا نے ان کی اندرونی کیفیت کا پتا دیا۔ زندگی میں میری ان سے یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی جو بہت سی گفتگوؤں پر بھاری تھی۔ اس میں شاہ جی نے اپنے دل کا صاف و شفاف آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ گفتگو تاثر پذیری کے بے شمار نقوش میری لوحِ قلب پر مرتسم کر گئی۔

میں نے واپس آکر مولانا کو تفصیل سے یہ باتیں سنائیں اور شاہ جی نے ان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا، اس کی وضاحت کی۔ ظاہر ہے خود مولانا بھی اپنے متعلق شاہ جی کے تاثرات معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھے اور میرا

انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں پورے غور اور توجہ سے سنیں اور دورانِ سماعت میں کئی مرتبہ اشکبار ہوئے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ بات چیت سے شاہ جی کی افسردگی کا اندازہ ہوتا تھا اور سننے والے بھی افسردہ تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ ؎

افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

شاہ جی کی جسمانی حالت اور نرمیٔ کلام کو دیکھ کر داغ کا یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہوش و حواس و تاب و توان داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

شاہ جی برصغیر کے بے مثال خطیب اور عظیم مجاہد تھے۔ قرآن مجید پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ قرأت و تجوید کے تمام لوازم کے ساتھ لحن داؤدی سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ اردو بولتے تو شبہ پڑتا کہ غالب، ذوق اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے۔ پنجابی میں بات کرتے تو محسوس ہوتا کہ راوی اور چناب نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں۔

وہ غلامی کے دور میں پیدا ہوئے اور غلامی کے شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس خطۂ ارض نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا، جن میں شہۂ آفاق سیاست دان بھی تھے اور اونچے درجے کے مقرر و خطیب بھی۔ منجھے ہوئے اصحاب درس و تدریس بھی تھے اور عالی مرتبے کے مصنفین و مؤلفین بھی۔ پاکیزہ وش صوفیا و اتقیاء بھی تھے اور اہل تحقیق مناظر و ناقد بھی۔ یہ حضرات ایک خاص فضا اور ماحول کی پیداوار تھے۔ اب ان اوصاف کے حامل لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے، جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالمِ وجود میں آئے تھے۔

شاہ جی اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ان لوگوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ صفِ اوّل میں جگہ پاتے تھے۔ ان کی تقریر میں شیر کی گرج، خطابت میں دریا کی روانی اور تنقید میں تلوار کی کاٹ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش میں پھولوں کی مہک اور گلاب کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

وہ انتہائی نرم گفتار بھی تھے اور بدرجۂ غایت تیز کلام بھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کرتے تو زبان آگ اگلنے لگتی اور توحید و سنت کے موضوع پر وعظ کہتے تو لہجہ بدل جاتا اور نرمی و ملائمت کا پیکر بن جاتے۔ وہ سحر طراز خطیب اور شیوہ بیان مقرر تھے۔ جو بات کرتے اخلاص میں ڈوب کر کرتے اور وہ بات سامعین کے دلوں کی گہرائیوں میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی چلی جاتی۔ جس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے متعلقات کی اس اسلوب میں وضاحت کرتے کہ حاضرین پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چھ چھ سات سات گھنٹے بے تکان بولتے اور دریا کی سی روانی سے بولتے۔ جب تک تقریر کا سلسلہ جاری رہتا ایسے محسوس ہوتا کہ فضا پر نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔ وعظ و تقریر میں ایسے ایسے لطائف و ظرائف اور حکایات بیان کرتے کہ محفل کشت زعفران بن جاتی۔ مجمع پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتا، وہ ہنساتے بھی تھے اور رُلاتے بھی۔ فارسی، اردو اور پنجابی کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس انداز میں شعر پڑھتے کہ معلوم ہوتا، شاعر نے اسی مقام کے لئے شعر کہا ہے۔

انہوں نے جگر داری کے ساتھ انگریز سے ٹکر لی، بہادری اور حوصلے کے ساتھ قید و بند کی سختیوں کو جھیلا اور جرأت و بے باکی سے حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی عزیمت ان کی عظمت کا پتا دیتی ہے، ان کا ایثار ان کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کی درویشی ان کی رفعت کو اجاگر کرتی ہے۔

اگر وہ اپنی خداداد قابلیتوں کی بنا پر پیری مریدی کی راہ اپناتے تو لاکھوں ہاتھ بیعت کے لئے آگے بڑھتے اور انسانوں کے گروہ کے گروہ قدم بوسی کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اگر دنیوی مال و منال کی طرف عنانِ توجہ مبذول کرتے تو اپنی جاذب قلب و نظر شخصیت کی بنا پر عوامی محبوبیت کا مرکز قرار پاتے اور سیم و زر کے اونچے اونچے ڈھیر اُن کے سامنے ہوتے۔

وہ اس وقت انگریز کے قلعۂ اقتدار میں شگاف ڈالنے کے لئے میدان میں اترے، جب اس کے خلاف منہ سے کوئی لفظ نکالنا اپنے آپ کو بے پناہ مصائب کے سپرد کر دینے کے مترادف تھا اور انہوں نے اس دور میں سلطان جائر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمۂ حق بلند کیا، جب اس کے حلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی تھا۔ انہوں نے تحریکِ ہجرت میں حصہ لیا، تحریکِ خلافت میں قربانیاں دیں اور ہر اس محاذ پر داد شجاعت دی، جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔ بلاشبہ ان کی سیاسی خدمات کا سلسلہ

بہت طویل اور انتہائی دردناک ابواب پر محیط ہے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد، جس کے بانیوں میں خود شاہ جی تھے، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مجلس احرار سے وابستہ رہے۔ اس میں یا تو درمیانے درجے کے لوگ شامل تھے یا غریب و نادار ... ! میرے خیال میں اس جماعت میں صرف ایک چودھری، ایک نواب زادہ اور ایک صاحب زادہ تھے۔

جبکہ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں نوابوں اور نواب زادوں اور صاحب زادوں اور چودھریوں اور سیٹھوں اور خان بہادروں اور سرکاری خطاب یافتوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ احرار کے نواب زادہ اور صاحب زادہ (نواب زادہ نصراللہ خاں اور صاحب زادہ فیض الحسن) کو میں نے مجلس احرار کے مرکزی دفتر لاہور میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں اس وقت دیکھا تھا، جب صوبہ بہار میں فسادات کا زور تھا اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور غریب مجلس احرار کے قائم کردہ بہار فنڈ میں غریب لوگ چندہ جمع کراتے تھے۔ میں بھی اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ، حال ضلع فرید کوٹ، مشرقی پنجاب) کے غریب مسلمانوں کی طرف سے تین سو ساٹھ روپے کی غریبانہ رقم جمع کرانے کے لئے مجلس احرار کے دفتر لاہور آیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس رقم کی رسید ثناءاللہ بھٹہ نے دی تھی اور انہی کے اس پر دستخط تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجلس احرار کے چودھری (افضل حق) جو بے چارے برائے نام چودھری تھے، ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے اور آزادی کے فوراً بعد نواب زادہ اور صاحب زادہ دونوں اس جماعت سے الگ ہو گئے۔ اور یہ جماعت بدستور قلندروں اور ملنگوں کی جماعت رہی۔ لیکن مجلس احرار کے یہ قلندر اور ملنگ اور درمیانے درجے کے لوگ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے، آزادئ وطن کے لئے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو احرار، انگریز کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گرفتار کر لئے گئے۔ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو جب کانگرس نے بمبئی میں "ہندوستان خالی کرو" ریزولیوشن پاس کیا تو اس کے سرکردہ لیڈروں اور بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجلس احرار کے قائدین و ارکان اس وقت جنگ کے بعد دوسری مرتبہ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس صورت حال کے متعلق سبھاش چندر بوس نے کانگرس پر طنز و طعن کے انداز میں ایک بیان میں کہا تھا کہ مجلس احرار کے ارکان کانگرسی نیتاؤں سے قربانی میں کہیں آگے ہیں جو آزادئ وطن کے لئے تین سال کے عرصے میں حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر کے دوسری مرتبہ جیلوں میں جا رہے ہیں۔

مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو شاید جیل جانے کا "مرض" لاحق ہو گیا تھا۔ جیل سے باہر کھلی فضا میں رہنا ان کو راس نہیں آتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے باہر رہتے تو انہیں سبکی سی ہونے لگتی اور اس کا علاج ان کے نزدیک جیل جانا ہی تھا۔

اس موقع پر مجھے آزادی سے پہلے کی دیوان سنگھ مفتوں کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ان کے اخبار "ریاست" کا ایک کالم "سوال و جواب" تھا۔ کسی نے ان سے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے عمائد و ارکان کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا، جن میں مجلس احرار بھی شامل تھی۔ انہوں نے تمام جماعتوں کے بارے میں جواب دیا اور ان کا دلچسپ تجزیہ کیا، مجلس احرار کے ارکان کے بارے میں ان کا جواب تھا کہ مجلس احرار ملک کی وہ سیاسی جماعت ہے، دھواں دھار تقریریں کرنا جس کے لیڈروں کا پیشہ ہے۔ وہ انگریز حکومت کے بھی خلاف ہیں، ہندوؤں کے بھی مخالف ہیں، کانگرس سے بھی ان کا تصادم ہے اور مسلم لیگ سے بھی چپقلش ہے۔ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، جلسوں میں جائیں تو نہایت معمولی ہوٹل یا تنور سے دال روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جیل سے باہر رہنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کئے رکھتے ہیں، جس کے باعث جیل جانا ضروری ہو جائے۔

برصغیر کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لئے شاہ جی نے جو جدوجہد کی وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کا طویل پس منظر ہوتا ہے، جس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور ہر دور میں متعدد جماعتیں اپنے اپنے انداز سے حصول آزادی کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ بہرحال سب کی مخلصانہ کوششوں سے آزادی کی نعمت میسر آتی ہے۔ شمع حریت کبھی کسی ایک ہی سمت سے صحن ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف اوقات و حالات میں مختلف سمتوں اور مختلف دروازوں اور ذریعوں سے آتی اور چمن زار وطن کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر بہت ہی "حساس" عناصر ان

چند لفظی تجزیئے کو اپنی سیاسی عصبیت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تو ہم عرض کریں گے کہ آزادئ وطن اور قیام پاکستان میں مجلس احرار اور شاہ جی کی تگ و تازِ مجاہدانہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہی جماعتوں کے ارباب قیادت کی سعئ مسلسل سے ہم نے انگریز کی غلامی سے چھٹکارہ پایا اور انہی کی قربانیوں کی بدولت ہم حریت و آزادی کے دور میں داخل ہوئے۔

کو کسی نہ کسی حد تک دور کرنے کے لئے اس قسم کا اسلوب اختیار کرنے کو میرے خیال میں نامناسب نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اسے دورِ مارشل لاء کی قانونی بولی میں "نظریۂ ضرورت" سے تعبیر کرنا چاہئے یا ہماری عام زبان میں "امرِ مجبوری" کہہ لیجئے۔

شاہ جی نہایت۔ حاضر جواب بھی تھے۔ ایک دفعہ دوران ۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کیوں مسجد میں بیٹھے اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ اٹھو میدانِ عمل میں نکلو، ملک و قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔

شاہ جی اور چھوٹے بڑے تمام قائدین احرار میں یہ خوبی تھی کہ ہر آن اور ہر حال میں خوش و خرم رہتے تھے۔ لطیفے بازی اور ہنسی مذاق ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس پر ان کی مخالف سیاسی جماعتوں کے بعض لوگ طعنہ زن بھی ہوئے، مگر احراریوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ احرار ہمیشہ برصغیر کی انگریزی حکومت کے معتوب رہے اور بعض مخالف سیاسی جماعتوں نے بھی انہیں ذہنی پریشانی میں مبتلا کئے رکھا۔ پھر ان کے مادی وسائل بھی بہت محدود تھے اور بعض تو مفلسی کی حالت میں تھے۔ اگر ان میں لطیفے بازی کی حس نہ ہوتی اور یہ لوگ ہنسی مذاق سے آشنا نہ ہوتے، ہر وقت ماتھے پر تیوریاں چڑھائے اور اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کئے رکھتے تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ انہوں نے ہمیشہ ہنسی مذاق اور لطائف و ظرائف میں غم غلط کرنے کی کوشش کی اور ان حالات میں ان کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے احساس

تقریر میں کسی نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ بلند ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا.....؟ انہوں نے فوراً جواب دیا۔ حضرت علیؓ میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طالب ہیں اور حضرت عمرؓ آپ کے مطلوب.....! اور مجھے میرے نانا کے طالب و مطلوب دونوں سے محبت ہے اور ان کی محبت میرا جزوِ ایمان ہے۔

شاہ جی کا سلسلۂ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ء) کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جب فہم و شعور نے انگڑائی لی اور عقل و خرد نے کچھ منزلیں طے کیں تو امرتسر آ گئے۔ سیاسی زندگی کا آغاز مولانا داؤد غزنوی کے کہنے سے ۱۹۱۹ء میں کیا جبکہ تحریک خلافت شباب پر تھی۔ بارہا جیلوں میں گئے اور طویل قیدیں کاٹیں۔ عمل و حرکت کے اعتبار سے انہوں نے بھرپور زندگی بسر

مجلس احرار کے یہ درمیانے درجے کے لوگ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے، آزادئ وطن کیلئے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کیلئے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

[بقیہ صٓ ۱۴ پر]

شاہ جیؒ

وہ اک ستارہ اندھیروں میں نور تھا جس سے
شریعتِ نبوی کا ظہور تھا جس سے

وہ ایک چاند جو شب کی جبیں کا جھومر تھا
وہ جس سے چہرۂ اہلِ وفا منوّر تھا

وہ آفتاب کہ جس میں بشارتیں تھیں بہت
جلو میں جس کے سحر کی سعادتیں تھیں بہت

ذرا بلند ہوئی تھی وہ ایک موجِ صدا
تمام اُفقۂ عہدِ فرنگ ڈوب گیا

ذرا سی تند چلی تھی وہ بادِ صرصرِ حق
بتانِ کفر کے دل پھٹ گئے جگر ہوئے شق

ذرا سی تیز ہوئی تھی چراغِ صدق کی لَو
قبائے تیرہ شبی کو جلا گیا پَر تو

ذرا جلال میں آیا تھا فقرِ آگاہی
ورق ورق ہوا سب دفترِ شہنشاہی

سکندری نے جو مانگا قلندری سے خراج
نہ وہ شکوہِ فرنگی رہا، نہ تختِ نہ تاج

لڑی ہے قوم جو برسوں جہادِ آزادی
ہوا شکستہ بالآخر جو طوقِ صیادی

جو کھل گیا درِ زنداں، جو کٹ گئی زنجیر
ہمیں جو خوابِ تمنّا کی مل گئی تعبیر

جو فکرِ قوم نے پہنا عمل کا جامہ بھی
ہے اس میں عزمِ بخاریؒ کا کارنامہ بھی

کتابِ ماہبری کا بیان مجمل ہے
ہنوز ناموں کی فہرست نامکمل ہے

اٹھیں گے چہرۂ ماضی سے پردہائے دقیق
مؤرخوں کو دیانت کی گر ہوئی توفیق

ذرا تو لائو تصوّر میں عہدِ جبرِ فرنگ
اڑا اڑا سا وہ رخسارۂ حیات کا رنگ

وہ سہمی سہمی فضا، وہ دھواں دھواں ماحول
زباں پہ مہرِ خموشی، دلوں پہ غلبۂ ہول

جبیں پہ داغِ غلامی، نظر میں جنبشِ خوف
ہمارے چار دانگ طرف خوں چکاں بلاؤں کا طوف

گھس آئے تھے جو لٹیرے ہماری سرحد میں
تمام قوم تھی ان کے عذاب کی زد میں

ہمارا دین، ہماری شریعتِ الہٰی
ہماری حکمت و دانش، ہمارے فکر و نظر

ہماری دولتِ کردار و سیرت و تہذیب
ہمارے علم و ثقافت، ہمارا ذہنِ نجیب

ہماری سوچ، ہمارا عمل، ہمارا ضمیر
ہمارے پورے تشخص کو کر لیا تھا اسیر

میں کیا بتاؤں غلامی کی زندگی کیا ہے
بس ایک مرگِ مسلسل ہے، بندگی کیا ہے

نظامِ جبر ہر اک آس چھین لیتا ہے
دلوں سے دولتِ احساس چھین لیتا ہے

یہ عہدِ جبر تھا یا دورِ ننگ و رسوائی
کہ دفعتاً اٹھے کچھ لوگ رہے کے انگڑائی

یہ لوگ شعلہ بیاں تھے، یہ لوگ شعلہ بجاں
مثالِ موجۂ مضطر، مثالِ برقِ تپاں

(بہ تبدیلِ بحر)

ایک شعلہ جو بہت بے تاب و برہم ہو گیا
شاہ صاحب کی خطابت میں مجسم ہو گیا

آندھیوں کا زور، بادل کی گرج، طوفاں کا جوش
سیل کی آہٹ، کڑکتے صاعقے جیسا خروش

زلزلہ، صرصر، تلاطم، آگ، لاوا، بانگِ صور
موت کی للکار، برزخ، نفرۂ یوم النشور

کاٹ میں ایک ایک لہجہ خنجرِ باطل شکن
گفتگو کی تیغِ براں اور فرمانِ "بزن"

جانِ باطل کے لئے ہر لفظ مرگِ ناگہاں
اہلِ ایماں کے لئے آبِ حیاتِ جاوداں

ایک جانب ہر خطابِ آتشیں حق کا جلال
ایک جانب ہر کلامِ دل نشیں حق کا جمال

ابرِ رحمت، رشحۂ الطاف، بارانِ کرم
شاخِ نرمک، برگِ گل، بادِ سحرگاہی کا نم

علمِ قرآن، آگہی، ایقان، تفکر، اعتقاد
شرع، ایمان، معرفت، حکمت، تفقہ، اجتہاد

رمز، ایما، طرفگی، ایجاز، تشبیہ و مثال
بذلہ سنجی، خوش دلی، نکتہ طرازی، اعتدال

قول، مصرع، ضلع، دوہا، کہہ مکرنی، چٹکلہ
طب و حکمت، ہیئت و سائنس شعر و فلسفہ

ایک کہسارِ بلاغت، محکم و گردوں نشیں
ایک دریائے فصاحت جس کی کوئی حد نہیں

جب تلاوت آشنا ہوتے تھے وہ گل ہائے لب
جگمگا اٹھتے تھے مانندِ سحر رخسارِ شب

سب پہ چھا جاتے تھے وہ شاداب موسم کی طرح
آیتیں ذہنوں کو تر کرتی تھیں شبنم کی طرح

ہاں توانائے اربابِ مجلس! ان کا اندازِ خطاب
جو دلوں میں تیر جائے وہ صدائے انقلاب

زندگی جاگی نوائے مردِ حق آگاہ سے
جی اٹھے دل اس صدائے قم باذن اللہ سے

ہم سے خاکِ آسودگاں کو جسم و جاں دیتے رہے
شاہ جی جا جا کے قبروں پر اذاں دیتے رہے

اس خطابت کے جلو میں دوسرا منظر بھی تھا
لفظ کے آئینے میں کردار کا جوہر بھی تھا

سختیاں، آلام، بیماری، مصائب، زجر و بند
ظلم، تعزیرِ وفا، دشنام، زندان، قید و بند

جبر کی ایک ایک آندھی کے مقابل ڈٹ گئے
یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے مرے مضمون سے
ملّتِ اسلام! اے روشن نصیب و خوش نظر

ہر چہ بادا باد، زندہ بچ گئے یا کٹ گئے
حریت کی داستاں لکھی گئی ہے خون سے
دیکھ اس انمول آزادی کی ظالم! قدر کر

خطۂ ارضِ وطن اک مشترک تعمیر ہے
شاہ جیؒ کا خونِ دل بھی شاملِ تعمیر ہے

جاہلانہ وقاحت کی عالمانہ وضاحت

حضرت مولانا قاضی محمد شمس الدین مدظلہ العالی کا یادگار مقالہ! جس میں بعض نام نہاد سُنّی اکابر کی صحابہ دشمنی کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت امیر معاویہؓ، اور حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے متعلق دجل و تلبیس اور کذب و تاویل کا ارتکاب کرنے والوں کا عظیم علمی محاسبہ، تحقیقی تعاقب، تاریخی تجزیہ ......!

یہ مقالہ جون (۶۹۰ء) کے ماہنامہ نقیب ختم نبوت میں شائع ہو کر بے پناہ پذیرائی حاصل کر چکا ہے اب ضروری تصحیح اور ——

انتہائی اہم اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں دست یاب ہے

سید عطاء المحسن بخاری مدظلہٗ کا زوردار ابتدائیہ —— چکوالی فتنہ، رفض اور باطنیت کا نیا روپ

دفتر نقیب ختم نبوۃ، دار بنی ہاشم، مہربان کالونی، ملتان۔ فون ۷۲۱۰۳

مسلمانو!

ہمارے صرف تین دشمن ہیں:

○ دشمنِ خدا ○ دشمنِ رسول ○ دشمنِ ازواج و اصحابِ رسول

آئیے

متحد ہو کر پاکستان کو کمیونسٹوں، مرزائیوں اور رافضیوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخریب کاری سے بچانے کا عہد کیجئے۔

عبدالمجید قریشی
ملتان

کاروانِ خطابت کا آخری نقیب

یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہلِ دنیا کی
ملا کے خاک میں ذکرِ کمال کرتے ہیں

بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں سے ایک کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کی ایک بیٹی تھی، نہایت حسین و خوش جمال، شہزادی کے حسن کا یہ عالم تھا کہ ہنستی تھی تو پھول برستے تھے اور روتی تھی تو موتی جھڑتے تھے۔ امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں میں آگے چل کر مجھے کچھ ایسے ہی حسین و جمیل مناظر دیکھنے کے مواقع میسّر آئے۔ ان کی تقریریں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے یہ شعر شاید ان ہی کی سحر بیانی اور طلاقتِ لسانی سے متأثر ہو کر کہا تھا ؎

شبنم کہیں گرائی، کہیں گل کھلا دیا
رویا کہیں کوئی تو کسی کو ہنسا دیا

انگریزی زبان میں مقرر کے لئے عام طور پر لیکچرار اور سپیکر کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں حضرت شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی خطابت کا ذکر مقصود ہو گا وہاں ہمیں اُن کے لئے انگریزی لغت سے لفظ (ORATOR) کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ان کی تقریر بے شبہ فصاحت و بلاغت کا ایک نادر اور بے مثال مرقع ہوتی تھیں۔ وہ جو مرزا غالب نے فرمایا ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

تو خدا ہی جانے کن کے لئے فرمایا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب شاہ صاحب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سلاست و روانی اور برجستگی بے اختیار ان کی زبان کے بوسے لیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس قومی کاروانِ خطابت کے آخری نقیب تھے جس کے سالارِ اوّل نوّاب محسن الملک مرحوم تھے۔ نوّاب صاحب کا شمار اپنے دور کے بہترین مقررین میں ہوتا تھا ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں اپنے

سامعین پر اتنا ہی اختیار ہوتا تھا جتنا اختیار ایک کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے ۔ یہ کمہار کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گندھی ہوئی مٹی کو جس شکل میں چاہے تبدیل کر دے ۔ اسی دور کے ایک بلند پایہ خطیب شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی بھی تھے ۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کی بھی دنیائے خطابت میں دھوم مچی ہوئی تھی ۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجتماعات ہوں یا انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے ڈپٹی صاحب خصوصی طور پر ان میں مدعو کیے جاتے ۔ ان کے بغیر قوم کی ان محفلوں کا رنگ نہ نکھرتا اور لوگ جب تک ان کو سن نہ لیتے ، بے کیفی سی محسوس کرتے رہتے ۔

شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کی وفات (۱۹۱۲ء) کے وقت برصغیر کے سیاسی مسائل میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں ۔ سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما جو ابھی کل تک حکومتِ وقت سے وفاداری بشرطِ اُستواری کی پالیسی پر گامزن تھے ۔ رفتہ رفتہ اب اس راہ سے ہٹتے چلے جا رہے تھے اور حکمرانوں کو آنکھیں دکھانے لگے تھے ۔ بلکہ مولانا حسرت موہانی تو آب سے کوئی چار یا پانچ سال قبل ہی اپنے ماہنامے "اردوئے معلّٰی" میں شائع کردہ ایک مضمون کی بنا پر بہ جرمِ بغاوت حوالۂ زنداں کئے جا چکے تھے ۔ برصغیر کے عوام اب بادۂ حریت سے سرشار ہو چکے تھے اور اس نشے کا اتارنا کسی ترشی کے بس کی بات نہ رہی تھی ۔ اس وقت گلستانِ خطابت میں جیسے فصلِ بہار آگئی تھی ۔ مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان میدانِ خطابت میں ابھرے اور بڑی شان کے ساتھ ابھرے ، ان کے ذرا بعد آنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا حسین احمد مدنی ، نواب بہادر یار جنگ ، ڈاکٹر کے ایم اشرف ، مولانا محمد داؤد غزنوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے ۔ ان حضرات کے میدان ہائے عمل مختلف تھے مگر مطمحِ نظر ایک ہی تھا اور وہ تھا حصولِ آزادیٔ وطن ، حضرت شاہ صاحب کا اسمِ گرامی میں " ترکش ما را خدنگ آخریں" کے طور پر آخر میں لے رہا ہوں ورنہ جہاں تک ان کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے وہ ہمیں ہر جگہ ممتاز ، یکتا اور منفرد نظر آتے ہیں ۔ حقیقت میں اس ملک میں وہ فنِ خطابت کے امام تھے ۔ جن لوگوں کو " الف لیلہ" پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس کتاب میں کس طرح ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی جاتی ہے ۔ کچھ ایسا ہی انداز شاہ صاحب مرحوم کی خطابت کا تھا گو وہ اپنی تقریر کے بہاؤ میں نفسِ مضمون سے کوسوں دور نکل جاتے تھے لیکن ان کی تقریر کی دلکشی و دلربائی کی یہ کیفیت ہوتی کہ بعض دفعہ عشاء سے فجر ہو جاتی تھی ، نہ کوئی اکتاتا اور نہ کسی آنکھ میں نیند آتی ۔ قرآن کریم کی تلاوت کا ان کا اپنا لب و لہجہ تھا ۔ یہ فریضہ وہ بڑے سوز و گداز کے ساتھ انجام دیتے ایک ہندو دوست نے کیا ہی خوب کہا کہ

قرآن کو سمجھنے کے طور پر دیکھنا ہو تو سید عطاء اللہ شاہ کو آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھو!

شاہ صاحب کی تقریر میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں قیام دلی کے دوران میں سُنی۔ پہاڑ گنج میں تانگوں کے اڈے کے برابر ایک بڑا سا گول میدان ہوا کرتا تھا جسے گول چکر کہا جاتا تھا یہ جگہ ہمیشہ جلسہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مجھے شاہ صاحب کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا پہلے پہل یہیں اتفاق ہوا تھا۔ وہ منظر اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ان دنوں برسات کا موسم تھا۔ گیارہ بجے شب کے قریب جب حضرت شاہ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو آسمان پر دُور دُور تک سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تقریر کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ پانچ سات منٹ بعد یہ پھوار ننھی منّی بوندوں میں تبدیل ہوگئی۔ موسم کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر سامعین کچھ گھبرائے لیکن اٹھے نہیں اور شاہ صاحب کی تقریر جاری رہی گو بوندیں ان کے اوپر بھی گر رہی تھیں۔ لیکن وہ تقریر کے ساتھ ساتھ حاضرین کی ذہنی کشمکش کا لطف اٹھانے پر تُلے ہوئے تھے۔ بارش ہلکے پھلکے انداز میں جاری تھی کہ دو ایک آدمی اٹھنے لگے۔ انہیں اٹھتا ہوا دیکھ کر شاہ صاحب جوش میں آگئے فرمانے لگے! "دلی والو! بس اتنے ہی مرد ہو کہ ذرا سی بوندوں سے گھبرا گئے۔ اس برتے پر تم عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے؟ ارے بخاری کی تقریروں میں تو تمہیں انگریزوں کی رائفلوں کی گولیاں بھی کھانی پڑیں گی اور تم ہو کہ ان دو چار بوندوں ہی سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ یاد رکھنا اگر بھاگ گئے تو پھر کبھی پہاڑ گنج کا منہ نہ دیکھو گا۔ ہاں یاد آیا، تم بھی پیسے ہوا جیب میں رکھے ہوئے نوٹوں کا خیال آگیا ہوگا۔" ان الفاظ کا شاہ صاحب کے منہ سے نکلنا تھا کہ لوگ دبک کر بیٹھ گئے۔ جلسے کا رنگ جم گیا حتّٰی کہ چند لمحات کے بعد بارش بھی تھم گئی۔

حضرت شاہ صاحب کے ایک دوسرے جلسے کا ایک دلچسپ اور پرلطف واقعہ انہی دنوں مجھے اپنے والد صاحب مرحوم کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا پاکستان کے قیام سے پہلے انبالہ (مشرقی پنجاب) میں "انجمن تبلیغ اسلام" کے نام سے ایک انجمن ہوتی تھی جس کے صدر میر غلام بیگ تیرنگ مرحوم تھے۔ میر صاحب اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر اور معتدل مزاج کے سیاست دان بھی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک مرکزی اسمبلی میں انبالہ ڈویژن کے مسلمانوں کی بلامقابلہ نمائندگی بھی فرماتے رہے۔ انجمن تبلیغ اسلام کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محض تبلیغ دین تھا۔ سیاسیات سے غالباً اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ انجمن کا سالانہ جلسہ انبالے میں منعقد ہونا قرار پایا میر صاحب نے ہندوستان کے جن مشاہیر علماء کرام کو اس موقع پر مدعو کیا ان میں حضرت شاہ صاحب بھی تھے۔ میر صاحب نے

شاہ صاحب سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کی تقریر محض تبلیغی ہو گی اور سیاسیات سے انہیں بہرصورت دامن بچانا ہو گا لیکن شاہ صاحب بھلا کہاں چوکنے والے تھے، پھر پھر کر آخر سیاست پر آ ہی گئے اور اپنی تقریر کا رخ فرنگی استعمار کے خلاف پھیر دیا۔ میر صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو کیا کہتے، بس چپکے سے کرسئ صدارت چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ دورانِ تقریر اب جو شاہ صاحب نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو کرسئ صدارت سے میر صاحب قبلہ غائب! شاہ صاحب مسکرائے اور فرمانے لگے "اچھا بھاگ گئے، اب تم صدارت کرو میرے بھائی"۔ یہ کہہ کر اپنا موٹا سا لکڑی کا ڈنڈا کرسئ صدارت پر رکھ دیا جس کا سامعین نے قہقہوں سے استقبال کیا۔

ملتان کا ذکر ہے مدرسہ قاسم العلوم کا سالانہ جلسہ تھا۔ جمعے کا دن تھا اور حاضرین کی کثرت سے باغ لانگے خاں جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا، پٹا پڑا تھا۔ جلسے کے مقررین میں حضرت شاہ صاحب کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا لیکن شاہ صاحب ابھی تشریف نہ لائے تھے اور لوگ بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شاہ صاحب کی صورت نظر پڑی اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر میں شاہ صاحب مائیکروفون کے سامنے تشریف لائے اور فرمانے لگے "ملتان والو! آج میں اپنی تقریر کا وقت ایک اور صاحب کو دے رہا ہوں جو ماشاء اللہ بہت ہی دلکش پیرائے میں تقریر فرمائیں گے"۔ لوگوں نے یہ سنا تو چلّانے لگے "نہیں شاہ صاحب آپ تقریر فرمائیں۔ ہم آپ کو سننا چاہتے ہیں"۔ شاہ صاحب بڑے تین لہجے میں فرمانے لگے "اللہ کے بندو! اللہ کی سرزمین ابھی اس کے نیک بندوں سے خالی نہیں ہوئی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری علاوہ بھی کچھ اور لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جنہیں خدائے بزرگ و برتر نے قوتِ گویائی سے مالا مال فرمایا ہے"۔ نہیں شاہ صاحب آپ! پھر کچھ لوگ چلّائے "نہیں نہیں"۔ شاہ صاحب کے لہجے میں اب قدرے تلخی تھی "آئیے حافظ صاحب تشریف لائیے"۔

لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج سے ایک نابینا بزرگ اٹھے اور مائیکروفون کی جانب بڑھنے لگے۔ شاہ صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں مائیکروفون کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بزرگ ڈیرہ غازی خان کے حافظ اللہ دسایا صاحب تھے۔ حافظ صاحب نے خطبۂ مسنونہ کے بعد قرآنِ حکیم کا ایک رکوع اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ تلاوت فرمایا کہ لوگ مسحور ہو گئے۔ واقعی شاہ صاحب نے درست فرمایا تھا۔ تلاوت کے بعد حافظ صاحب نے فضائلِ حدیث پر ملتانی زبان میں تقریر کا آغاز کیا۔ عجب مٹھاس، حلاوت اور شیرینی تھی ان کی تقریر میں کہ مقامی اور مہاجر سبھی جھوم رہے تھے۔ مجھے اس روز محسوس ہوا کہ لسانی تعصب کس قدر غیر ضروری اور بے معنیٰ سا جذبہ ہے۔ کسی زبان

کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہمیں اُس وقت ہوتا ہے جب ہم اُس زبان کو کسی اہلِ زبان کی زبانی سنتے ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو از خود بُری نہیں بلکہ ہماری عصبیت اور کوتاہ نظری اسے ہمارے دل و دماغ کے سامنے بُری شکل میں پیش کرتی ہیں۔

۱۹۵۷ء کی ابتدا میں ملتان ہی کے ایک جلسے میں شاہ صاحب اپنی تقریر میں اُس جنگِ اقتدار پر تبصرہ فرما رہے تھے جو پاکستان میں وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد لڑی جا رہی تھی۔ جب چندریگر مرحوم کا ذکر آیا تو انہوں نے ایک چھوٹا سا فقرہ کہا جسے سن کر لوگ پھڑک اٹھے فرمایا "ایک چلتہ وہ بھی کاٹ گئے"۔ یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ چندریگر صاحب کی وزارتِ عظمیٰ کی عمر قریب قریب چالیس دن ہی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کا ایک یادگار واقعہ مجھے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مرحوم مالک دواخانہ سلیمانی جہانیاں نے بھی سنایا تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کو ابھی چند ماہ گذرے تھے ان دنوں واہگہ کی سرحد پر دونوں ملکوں کے شہریوں میں تبادلے کا سلسلہ چل رہا تھا اور سکھ تاجر من جملہ اور اشیاء کے نادر و نایاب اسلامی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت کر جاتے تھے یہ گرانمایہ کتابیں مشرقی پنجاب کے اسلامی کتب خانوں کی متاعِ بے بہا تھیں۔ مشرقی پنجاب کے خونیں ہنگاموں میں ہزارہا کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں، کتنی ہی کتابوں کو دریا برد کر دیا گیا قرآن کریم اور احادیثِ رسولؐ کے اوراق بازاروں میں روندے گئے۔ بہر حال جو کتابیں محفوظ رہ گئیں وہ اس طرح فروخت کی جاری تھیں۔ ان بیچنے والوں کو کیا معلوم کہ یہ کس کان کے جواہر یکتا ہیں اور ان کے خریدنے اور جمع کرنے والوں نے خدا جانے کس کس طرح خریدا اور جمع کیا تھا۔ انہی ایام میں ایک صاحب نے میرے لئے دو کتابیں خریدیں جن میں سے ایک مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" تھی جس کی بارہ جلدیں یکجا مجلد تھیں۔ اس کتاب کو صرف پانچ روپے میں خریدا گیا تھا حالانکہ اس زمانے میں یہ بالکل نایاب تھی اور سو سوا سو روپے سے کم میں نہیں ملتی تھی۔ دوسری کتاب "مفردات امام راغبؒ" تھی۔ اس کتاب کا شمار بھی نہایت کمیاب کتابوں میں ہوتا تھا اور یہ صرف دو روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "پیش کش من جانب محمد گل شیر بخدمت گرامی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کتاب کو مولانا محمد گل شیر صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا اور جب فسادات امرتسر میں دوسرے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا کتب خانہ بھی لُٹا تو کتابیں بکھر بکھر کر فروخت ہونے کے لئے واہگہ کی سرحد پر آ گئیں۔ مجھے جب اس کتاب کا تعلق شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی سے معلوم ہوا تو میں بے چین ہو گیا اور اگلی مرتبہ جب لاہور جانا ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تاکہ اسے شاہ صاحب کے حوالے کر دوں۔ میں اس مقصد کے لئے سب سے پہلے مجلس احرار کے دفتر پہنچا جہاں ان دنوں شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ چونکہ شاہ صاحب اس

وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی تاہم کتاب کو میں نے دفتر کے ایک صاحب کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اسے شاہ صاحب کی خدمت میں میری جانب سے پیش کر دیا جائے۔ شاہ صاحب کو جب کتاب ملی تو سُنا ہے کہ شدتِ غم سے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے ملاقات ہوئی تو بڑی ممونیت کا اظہار فرمایا اور پھر اس واقعے کا ذکر مختلف محفلوں اور متعدد تقریروں میں بطور خاص کیا۔

اس واقعے کا تحیر کن اور ناقابلِ فراموش پہلو یہ ہے کہ پہلی کتاب یعنی تفسیر بیان القرآن بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ملکیت تھی۔ یہ تفسیر آج بھی میرے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کے مختلف مقامات دیکھنے کا مجھے متعدد بار موقع ملا لیکن اس حقیقت کا پتہ مجھے شاہ صاحب کی حیات میں نہ چلا بلکہ ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد یہ بات معلوم ہوئی اور وہ یوں کہ جس مقام پر بیان القرآن کی چوتھی جلد ختم ہوتی ہے وہاں ایک گوشے میں شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے "احقر عباد اللہ السید شرف الدین احمد المعروف بہ سید عطاء اللہ البخاری العظیم آبادی عفرلہ البادی" تحریر فرمایا ہوا تھا۔ مجھے شاہ صاحب کے یہ الفاظ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ ان کی یہ علمی نشانی میرے پاس ہی رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ حقیقی معنوں میں درویش تھے۔ ان کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ وہ امرتسر میں دو مکان چھوڑ کر آئے تھے لیکن انہوں نے اس جائداد کا کوئی کلیم کسی عدالت میں پیش نہیں کیا کہ جب اس جائداد کے بدلے یہاں جائیداد مل گئی تو ہجرت کا ثواب ہی جاتا رہے گا۔ شاہ صاحب کا یہی کردار ایک دوسرے واقعے سے بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

دیر کی بات ہے شاہ صاحب اُن دنوں بہاول پور میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب بہاول پور کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ سیکرٹری صاحب نواب صاحب کا پیغام لے کر شاہ صاحب کے پاس پہنچے شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا کہ فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے۔ پھر ہنسے اور فرمانے لگے کہ اب تو میں ویسے بھی ان کی ریاست میں بحیثیتِ مہمان مقیم ہوں۔ اب یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ وہ میزبان کی عزت و توقیر میں پیش قدمی فرمائیں۔ چنانچہ سیکرٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اگلے دن نواب صاحب بہاول پور بہ نفسِ نفیس شاہ صاحب سے ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے۔ شاہ صاحب نے اس خطیر رقم کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "فقیر کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ نواب صاحب نے اصرار کیا تو ان کی تالیفِ قلب کے لئے دس ہزار روپوں میں سے صرف دس روپے اٹھا لئے۔

باتیں ہماری یاد رہیں گی !

تحریر: مرزا محمد حسن چغتائی

حضرت امیرِ شریعتؒ کا رام کلی (میلسی) میں پہلی بار وُرود

قبل از قیام پاکستان (کوئی پانچ چار سال پہلے) رام کلی کا ایک شخص حضرت امیرِ شریعتؒ کی خدمت میں کسی جگہ پہنچا اور وہاں کے حالات بیان کرنے کے بعد ضرورت کے پیشِ نظر ایک تاریخ مقرر کرنے کی استدعا کی۔ حضرت شاہ جیؒ نے ڈائری کا جائزہ لیا۔ اور تاریخ دے دی۔ اس کے بعد داعی نے شاہ جیؒ سے کوئی رابطہ قائم نہ کیا۔ لیکن شاہ جیؒ اپنے وعدہ پر قائم تھے۔ جیسا کہ اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے۔ کہ میں سید زادہ ہوں اور مجھ سے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ باوجود رابطہ نہ ہونے کے آپ نے امرتسر سے کہروڑپکا کا سفر طے کیا۔ اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے مقررہ تاریخ کی صبح کو کہروڑپکا پہنچ گئے۔ اطلاع ملنے پر سبھی در کرجمع ہوگئے، اور حکم دیا کہ مجھے رام کلی بھجوایا جائے جلسہ کے سلسلہ میں کارکنان نے بالکل بے خبری کا اظہار کیا۔ لیکن تعمیلِ حکم میں حاجی نور محمد صاحب مرحوم نے تانگہ کا انتظام کر کے حافظ عبدالمجید شاکر (مرحوم) کو شاہ جیؒ کی معیت میں روانہ کر دیا۔ راستہ میں واقف کار لوگ دریافت کرتے اور کسی پروگرام سے لاعلمی کا اظہار کرتے۔ تا آنکہ بستی کے بالکل قریب پہنچ کر جب کسی سے اس داعی کا نام لے کر شاہ جیؒ نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ شخص "وہابی" قسم کا تھا۔ جس کو بستی والوں نے کافی دنوں سے یہاں سے نکال دیا ہے اور اب پتہ نہیں کہاں رہتا ہے۔

بستی کے کنارے پر مدرسہ کی عمارت تھی۔ جب یہ قافلہ وہاں پہنچا۔ تو مدرس صاحبان نے یہ معلوم کر کے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آ گئے ہیں۔ اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ سکول بند کر دیا۔ لیکن بند کرتے کرتے جلدی میں ایک چارپائی، کرسی اور میز باہر بھول گئے۔ اسی اثناء میں سکول سے نکلنے والے بچے بھی شاہ جیؒ کے اردگرد جمع ہوگئے۔ اور شاہ جیؒ نے سکول کی چھوٹی سی چار دیواری والی بغیر چھت کی مسجد میں ڈیرہ لگا دیا۔ اور بچوں سے کہہ کر چارپائی، کرسی اور میز وہیں منگا لی۔ حافظ عبدالمجید صاحب کو فرمایا! کہ ظہر کی اذان کہی جائے۔ اذان سن کر کوئی پانچ سات آدمی بستی کے اور دو چار رہ گذر بھی آ گئے۔ بہر حال اچھی خاصی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی نماز سے فارغ ہو کر شاہ جیؒ نے حافظ عبدالمجید شاکر کو حکم دیا۔ کہ وہ کچھ بیان کرنا شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے

وعظ شروع کر دیا، اور جو آدمی نماز میں شریک ہوئے وہ وعظ سننے بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ میں کچھ پانچ چار آدمی اور بھی آ گئے۔ جس کے بعد شاہ جیؒ نے اپنی گرجدار اور مؤثر آواز میں قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ جہاں جہاں شاہ جیؒ کی آواز پہنچ گئی، لوگ آواز سن کر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کی تلاوت کے بعد شاہ جیؒ نے خطبہ دے کر باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔ اس اثناء میں اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ شاہ جیؒ نے اختلافی مسائل کے حل کو سمجھانے کے لئے جب یہ شعر پڑھا:

مُحَمَّدٌ بَشَرٌ وَّ لَیْسَ کَالْبَشَرِ
بَلْ ھُوَ یَاقُوْتٌ وَالنَّاسُ کَالْحَجَرِ

اور اس کے مطالب پر روشنی ڈالی تو تمام مختلف مسائل حل فرما دئے آپ نے زور دار انداز میں فرمایا "یاد رکھو، بشر بشر میں فرق ہے جیسے پتھر پتھر میں فرق ہے۔ ایک وہ پتھر ہے۔ جو سڑک میں کوٹ دیا گیا۔ وہ بھی تو پتھر ہی ہے۔ جو کسی بادشاہ کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ اور تاج شاہی میں ٹنک رہا ہے، حجر اسود بھی تو پتھر ہے جس کو چومنے کے لئے دنیا ترس رہی ہے"۔ پھر تقریر مسلسل دو گھنٹوں تک جاری رہی۔ اور تقریر کے اختتام پر وہی لوگ جو داعی کو مار بھگانے کے مرتکب تھے۔ شاہ جیؒ کے حلقہ بگوش بن گئے جن میں مہر جان محمد وغیرہ بھی شامل تھے۔ جو زندگی بھر مجلس احرار اسلام کے کارکن رہے۔

مزاح لطیف

اپنی تقریر کے دوران حافظ عبدالمجید کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے میرے عزیز نے جو آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ کسی مسلم لیگی سے پڑھا ہے۔ یہ بات کہہ کر مجمع کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیا۔

(— میں نے حافظ صاحب سے دریافت کیا۔ تو انہیں آیت یاد نہ تھی۔ محمد حسن مرتب)

حافظ عبدالمجید شاکر اور شاہ جیؒ

حافظ عبدالمجید شاکر مرحوم جو میرے حقیقی بھانجے تھے۔ وہ اپنی والدہ سمیت شاہ جیؒ سے بیعت تھے۔ مجھ سے بیان کیا کہ میں شاہ جیؒ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خلوت کا موقع میسر نہ آتا تھا۔ ایک بار ملتان میں حاضری دی۔ تو حضرت اپنی فرودگاہ میں چارپائی پر دراز تھے۔ اور میں بیٹھا پاؤں دبانے کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔ الحمد للہ کہ خلوت کا موقع مل گیا۔ بے باکانہ عرض کیا:

"حضرت! آپ کے ہزاروں مرید ہیں۔ آپ نے مرید تو بنائے۔ لیکن آپ نے ان کے اصلاح کی کوئی فکر کی قیامت کے دن کیا جواب دیں گے"؟

میرا یہ کہنا تھا کہ حضرت اٹھ بیٹھے آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ فرمانے لگے:

"آج تم نے ایسی بات کی ہے جو آج تک کسی نے نہیں کہی۔ ہزاروں مرید آتے ہیں کوئی مسئلہ پوچھتا ہے کوئی مال واولاد کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بس دنیوی جاہ وجلال کی باتیں ہوتی ہیں"۔ یہ کہہ کر تھوڑی دیر سکوت فرمایا۔ پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر استفسار کیا کہ کیا پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ مدعا تو حضرت نے معلوم کرلیا۔ ارشاد ہوا کہ

پانچ وقت کی نماز، رزق حلال کی سعی، اور کلمۂ تمجید کا ورد

میں نے عرض کیا کہ کچھ اور؟ فرمایا، بس۔ میرے مرشد کا فرمان ہے۔ کہ جو شخص رزق حلال کماتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز کا پابند ہے۔ اور کلمۂ تمجید کے ورد کا صبح وشام اہتمام رکھتا ہے اگر روز قیامت خداوند قدوس اسے جہنم کی طرف دھکیلیں گے۔ تو میں خدا سے لڑ پڑوں گا۔

پاؤں کا انتقام

(بروایت حافظ عبدالمجید شاکر)

زندگی کے آخری ایام میں جب آپ مسلسل علالت کا شکار تھے۔ مجھے ملتان میں محترم منشی ابوالحسن کھرڑوی کی معیت میں حاضری کا موقع نصیب ہوا! گھر پر گئے تو معلوم ہوا کہ حکیم حنیف اللہ صاحب کی دکان پر گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم وہاں حاضر ہوئے آپ تیار بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اس وقت اس مرد مجاہد کی نقاہت کا یہ عالم تھا۔ کہ ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور دوسرا منشی صاحب موصوف کے کندھے پر اور چلنا شروع کیا۔ راستے میں فرمایا۔ کہ عزیز! میرے پاؤں اب انتقام پر اتر آئے ہیں۔ میں نے بھی تو انہیں کچھ کم سزا نہیں دی اب یہ مجھے سزا دے رہے ہیں۔

حرف آخر

آخر میں حافظ عبدالمجید شاکر مرحوم نے کہا کہ شاہ جیؒ اس دنیا میں نہیں رہے، اور رہنا کسی نے بھی نہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ نامعلوم شاہ جی جیسا قادر الکلام اور فصیح اللسان اور اور مجاہد جلیل پھر کب پیدا ہو۔ الحمد للہ ہمارے احباب میں حق گو علماء وفضلاء اور مقررین کی کمی نہیں۔ ہر دوست کا فرض ہے کہ وہ بخاری کے مشن کو زندہ رکھنے اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں اپنے شب وروز صرف کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔

بہاول پور گھلواں میں پہلی بار ورود

شاہ جیؒ جب اوّل بار بہاول پور گھلواں (تحصیل احمد پور شرقیہ) میں تشریف فرما ہوئے۔ تو جلسہ کا انتظام ایک ایسے میدان میں کیا گیا۔ جہاں ایک پرانے پیپل کے درخت کا وسیع و عریض سایہ جلسہ گاہ کے لئے موزوں تھا۔ شاہ جیؒ نے وہاں تشریف رکھنے کے بعد تقریر شروع کرنے سے قبل فرمایا کہ مجھے اس جگہ پچھوں کتوں کی بدبو آرہی ہے اس لئے میں اس جگہ وعظ نہ کروں گا۔ منتظمین اور دیگر معتبرانِ علاقہ نے بتایا کہ اس بات سے ہمیں انکار نہیں کہ یہاں پر کچھ اور کتے لڑائے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری مجبوری ہے کہ اس جگہ کوئی موزوں میدان موجود نہیں۔ جہاں سایہ کا انتظام ہو اور مجمع کے لئے کافی گنجائش ہو۔ وہ شخص جو پچھ کتوں کی لڑائی کا دھندا کرتا تھا۔ وہ بھی مجمع سے نکل کر شاہ جیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور توبہ کر کے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ وہ اس مذموم فعل کا اعادہ نہ کرے گا۔ پھر بھی شاہ جیؒ نے خوشی سے نہیں بلکہ طوعاً و کرہاً تقریر کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تقریر تین چار گھنٹوں تک جاری رہی۔ اور جب اختتام کو پہنچی تو شاہ جیؒ نے قیام گاہ کی طرف روانہ ہوتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ "یہ پیپل کا درخت ان شاء اللہ کل یہاں نہ ہوگا"۔ شاہ جیؒ کی اس بات کو لوگوں نے استعجاب سے سنا۔ لیکن دوسرے روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ صبح ہی صبح دریا میں سیلاب آیا۔ جس سے یہ بستی بھی محفوظ نہ رہی، اور پیپل کے درخت کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ جڑوں سمیت نکل کر باہر آپڑا اور اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔

اس واقعہ کو سن کر ملک پیر بخش خان گھلّو زمیندار شاہ جیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بدکرداریوں پر نادم ہوا اور تائب ہو کر شاہ جیؒ سے بیعت ہوا۔ اور اس طرح سے ملک صاحب اور ان کے خاندان کا دائمی تعلق شاہ جیؒ سے استوار ہو گیا۔ بلکہ علاقہ کے ولی اللہ حافظ کریم بخشؒ کی بدولت شاہ جی کی ڈاٹری میں تقریب میلاد النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہاول پور گھلواں کے لئے "ریزرو" ہو گئی۔

علاقہ میلسی کا ایک واقعہ

علاقہ میلسی کے ایک زمیندار نے شاہ جیؒ سے وعظ کے لئے وقت لیا شاہ جیؒ وعدہ کے مطابق پہنچ گئے۔ زمیندار نے جلسہ کے آغاز سے تھوڑی دیر قبل شاہ جیؒ کو بتایا کہ اس کے بیٹے نے ایک طوائف کو اپنے گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ اور ہماری عزت خاک میں مل گئی ہے اپنی تقریر میں اس کو شرم دلائیں۔ ان لوگوں نے صدارت کی کرسی پر بغیر شاہ جی کو

بتلائے اسی نوجوان کو بٹھا دیا۔ شاہ جیؒ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد ارکانِ اسلام کی پابندی اور اصلاح الرسوم کے بارے میں بیان شروع کیا اور جب تقریر عروج پر پہنچی تو اس معاملہ کا ذکر چھیڑا۔ صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہوا نوجوان پہلے تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد جرأت کر کے اپنی کرسی سے اٹھ کر شاہ جیؒ سے مؤدبانہ عرض کیا کہ حضرت! میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ باقاعدہ نکاح کر کے عورت کو گھر میں لایا ہوں۔ شاہ جیؒ کا یہ سننا تھا کہ فوری طور پر تقریر کا کانٹا بدلا۔ اس نوجوان کو گلے لگا کر تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ شاباش بیٹے! تم نے بہت بڑا جہاد کیا اور بڑی نیکی کا کام کیا ہے۔ مجھے تو اندھیرے میں رکھا گیا اور نکاح کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ ورنہ میں تمہیں مبارک باد دیتا کہ تم نے ایک فاحشہ کو ذلت کے زندگی سے نکال کر عزت بخشی، اور خود بھی کاربد سے بچ گئے۔

پھر اس کے بعد اسی واقعہ کو موضوعِ سخن بنا کر اس قدر مؤثر خطاب فرمایا کہ مجمع عش عش کر اٹھا۔

روایت: حافظ نورالحسن (عطر فروش) (مقیم مکہ مکرمہ)

حافظ پیر بخش نابینا کا واقعہ

قبل از تقسیم کے زمانہ کی بات ہے کہ امیر شریعتؒ کی تقریر کا پور کی بستی خانہ (علاقہ کہروڑ پکا) میں پروگرام بنا۔ امیر پور سادات میں حافظ پیر بخش نابینا رہا کرتے تھے۔ جو کوئی پانچ سات سال قبل فوت ہوئے ہیں۔ انہوں نے جلسہ میں شمولیت کا ارادہ کیا۔ لیکن اپنے دوست احباب سے اس امر کا تذکرہ کرتے رہے کہ "میرا دل شاہ جیؒ کو ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن مجھ محتاج آدمی کو کون ان کے نزدیک پھٹکنے دے گا۔ گلے ملنے کا شوق کون پورا کرنے دے گا۔ چلو کہیں دور سے تقریر سن لوں گا۔ یہی غنیمت ہے" وہ اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جلسہ کا موقعہ آگیا اور یہ حافظ جی بھی وہاں شاہ جیؒ کی تشریف آوری سے قبل پہنچ گئے۔ جس وقت شاہ جی تشریف لائے۔ ہزاروں لوگوں کا اژدحام تھا۔ یہ نابینا حافظ کہیں ایک طرف کھڑے ہو کر دل ہی میں کڑھتا رہا۔ شاہ جیؒ کے تشریف لانے پر لوگ مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑے۔ نعروں کا غلغلہ اس قدر تھا کہ کسی کی آواز بھی ایک دوسرے کو سنائی نہ دیتی تھی کہ معاً شاہ جیؒ نے مجمع کے درمیان میں راستہ بنانا شروع کر دیا۔ اور فرمایا کہ مجھے ایک آدمی کو ضروری ملنا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہ جیؒ حافظ صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اور ان کو جھنجوڑ کر کہا "حافظ جی! آپ پریشان نہ ہوں عطاء اللہ شاہ خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اور مصافحہ کر کے معانقہ کیا اور ان کو خوب بھینچ کر بولے۔ کہ "حافظ جی آپ راضی ہیں؟ چلو آپ کو سٹیج کے قریب بٹھا دیتا ہوں"۔ ان کو پکڑ کر سٹیج پر ہمراہ لائے۔ اور نزدیک ہی بٹھا دیا۔ حافظ جی کی یہ حالت تھی کہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور پھر زندگی بھر اس واقعہ کو دہراتے رہے اور

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

ماضی کے جھروکوں سے

حضرت مولانا قاضی محمد شمس الدین مدظلہ

امیر شریعتؒ اور فرنگی خانقاہ کے درویش

حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہ (آف کندیاں شریف) جس زمانہ میں، دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ (ضلع سرگودہا) میں متعلم تھے، اس زمانہ میں جامع مسجد بھیرہ کی تولیت پر مولانا محمد یحییٰ بگویؒ اور مولانا ظہور احمد بگویؒ کے درمیان یار لوگوں نے تنازعہ پیدا کر دیا۔ مولانا ظہور احمد بگویؒ نے اپنا شرعی ثالث حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو بنایا اور مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے صاحبزادہ قمر الدین صاحب سیالویؒ کو اپنا ثالث بنایا۔ سیالوی صاحبؒ بوقت ضرورت خود تو تشریف نہ لا سکے مگر اپنی طرف سے صاحبزادہ سعد اللہ صاحب کو بھیج دیا۔ یہ صاحبزادہ سعد اللہ صاحب ضلع سرگودہا میں سرکار برطانیہ کے خاص سرکاری درباری آدمی تھے اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ جب یہ حضرات بھیرہ میں جمع ہوئے تو ان کے طعام کی خدمت پر حضرت مولانا خان محمد (مدظلہ) مقرر تھے۔ حضرت مولانا بیان فرماتے ہیں کہ صبح کی چائے کے دوران صاحبزادہ سعد اللہ صاحب نے ایک سفید کاغذ حضرت امیر شریعتؒ کو پیش کیا اور کہا کہ آپ اس کاغذ پر صرف "سید عطاء اللہ شاہ بخاری بقلم خود" تحریر فرما دیں تو اس کے اوپر میں صرف ایک سطر یہ لکھ دوں گا کہ "میں آئندہ حکومت برطانیہ کی مخالفت نہیں کروں گا" اگر آپ ایسا کرنا منظور فرمائیں تو میں آپ کو بیس مربع آباد نہری زمین آج ہی دلا دیتا ہوں۔ اس سے آپ کی سات پشتیں مزے کریں گی اور آپ بھی شہر شہر پھرنے سے بچ جائیں۔ زندگی آرام و آسائش سے کٹے گی۔ اور آپ کی اس خدمت کے صلے میں مجھے بھی تین مربع نہری زمین مل جائے گی۔

حضرت امیر شریعتؒ مسکرائے اور صاحبزادہ سعد اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صرف اتنا فرمایا۔

"جی ہاں سائیں! آپ ہوئے جو فرنگی خانقاہ کے درویش!"

اور اب صاحبزادہ صاحب کا یہ حال تھا کہ بقولِ غالب

ع "نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے"

مجھے کب تک آزماؤ گے؟

حضرت امیر شریعتؒ کے جاں نثار ساتھی، حضرت مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ نے سنایا کہ حضرت شاہ جیؒ کو جو

کچھ مالی فتوحات ہوتی تھیں، آپ گنتے نہ تھے بلکہ کرُتے کے لمبے سے بغلی جیب میں ڈال لیتے تھے۔ اور یہ حضرتؒ کا ساری عمر کا معمول تھا۔ مولانا میانویؒ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ شاہ جی! آپ روپے پیسے گنتے نہیں؟ فرمایا ـــــ بالکل نہیں، جو آتا ہے جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ ضرورت پڑتی ہے تو حسبِ ضرورت نکال کر دے دیتا ہوں۔

پھر فرمایا ـــــ جب سے میں نے سورۂ هُمَزَة کی آیت جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ پڑھی ہے، پیسے گننے چھوڑ دئے ہیں۔ اور نہ گننے کے باوجود اللہ تعالیٰ میری جیب خالی نہیں ہونے دیتا۔

مولانا میانویؒ فرماتے تھے کہ جب شاہ جیؒ یہ فرما چکے تو جانے میرے دل میں کیا خیال آیا اور مجھے کیا سوجھی کہ میں نے ایک روز چپکے سے شاہ جیؒ کی جیب میں سے چونسٹھ (۶۴) روپے نکال لئے اور شاہ جیؒ کو پتا بھی نہ چلا! اب اس بات کو ایک عرصہ ہوگیا اور شاہ جیؒ کو اس حرکت کا شائبہ تک نہیں گزرا تو مجھے سخت ندامت اور پریشانی ہونے لگی کہ اب کیا کیا جائے؟ آخر ایک روز میں نے جی کڑا کر کے حضرتؒ سے تنہائی میں کہا کہ حضرت یہ کچھ پیسے ہیں، آپ قبول فرمالیں! شاہ جی اس اچانک "التفات" پر حیران ہوئے اور شگفتہ انداز میں فرمایا "حضرت سخی سرور صاحب! یہ تو کہئے کہ یہ کیسے روپے ہیں؟ آج کاہے کو عنایات ہو رہی ہیں؟" میں نے کہا "شاہ جی کوئی خاص بات نہیں، بس آپ یہ قبول فرمائیں" لیکن شاہ جیؒ اس خلافِ معمول عمل کا پس منظر جاننے پر مُصر ہو گئے۔ میرا گریز و انکار کچھ کام نہ آیا۔

فرمانے لگے ـــ صاف بتاؤ بات کیا ہے؟

لاچار ـــ میں نے عرض کی کہ شاہ جی! ایک دفعہ میں نے آپ سے سُنا تھا کہ آپ پیسوں کا حساب نہیں رکھتے اور میں نے یونہی ذرا آزمانے کو موقع پاکر آپ کی جیب سے چونسٹھ (۶۴) روپے نکال لئے۔ ایک عرصہ ہوگیا ہے کہ میں نادم بھی ہو رہا ہوں اور جرأت بھی نہیں کر پا رہا کہ آپ سے یہ ساری حقیقت کہہ ڈالوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف فرما دیجئے اور یہ اپنے پیسے بھی لے لیجئے۔

مولانا میانویؒ فرماتے کہ جب میں نے شاہ جیؒ کو پیسے لوٹانا چاہے تو شاہ جیؒ یکبارگی متغیر سے ہوئے اور پھر کھلکھلا کر فرمایا "میانوی کب تک مجھے آزماتے رہو گے"۔ اور یہ کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر مسکرا کر فرمانے لگے

"یہ چوری کا مال میں تو لینے سے رہا اب تمہی استعمال کرلو"

یہ سنا کر مولانا میانویؒ اشک بار ہو جاتے! سبحان اللہ کیا شان ہے توکل کی، اور پاک باطنی کی!

مولانا مدرار اللہ مدرار نقشبندی
ڈسٹرکٹ خطیب مردان

سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاریؒ — اور تحریکِ پاکستان

امیر شریعت، بطلِ حریت حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک بے مثل خطیب اور شعلہ بیان مقرّر تھے۔ آپ آزادیٔ وطن کے قافلہ سالار اور تحریک تحفظ ختم نبوّت کے روحِ رواں تھے۔ آپ نے مرزا قادیانی کی نبوّت کا ذبہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ اور نوجوانانِ ملّت کے دلوں میں صحیح اسلامی جذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ آپ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جو ایک کامیاب خطیب کے لئے ضروری ہیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ شاہ جی موقع و محل کی مناسبت و موزونیت کے پیشِ نظر ظرافت و لطافت کا انداز بھی اختیار کرتے تھے۔ اور اپنے تکلمِ ظرافت سے سامعین کو بہرہ ور کرتے۔ آج تک آپ کے تکیں اور مزاحیہ چٹکلے اور فقرے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

مردان کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۹۴۰ء میں مردان تشریف لاکر اہل مردان کو اپنی سحر انگیز خطابت اور ولولہ انگیز ارشادات سے نوازا۔ ان کی تشریف آوری کے موقع پر مال منڈی مردان میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ردّ مرزائیت کے علاوہ اس وقت کے ملک کے حالات اور سیاسیات پر ایک دلنشین تقریر فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بندہ کو شاہ صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ ان کی شگفتہ بیانی سے محظوظ ہوا۔

شاہ صاحب اور قیامِ پاکستان

اگرچہ شاہ صاحب اپنے سیاسی نظریات کے تحت تحریک پاکستان کے ایک گونہ مخالف تھے۔ لیکن

بایں ہمہ جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے دل و جان سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور فرمایا۔

"میں اپنی رائے میں ہار گیا جناب جناح ——" اور لیگ اپنے مشن اور رائے میں کامیاب ہوئی۔ نیز فرمایا "یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی لیکن جو کچھ کہا اور جو کچھ صحیح سمجھا وہی کچھ کیا۔ ہمارا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں"۔

امیر شریعت نے یہ بھی فرمایا

"میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو اب پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مجلسِ احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے

ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور خلافِ شرع کام میں مزاحمت !"

امیرِ شریعت اور دفاعِ پاکستان

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان مرحوم نے جب بھارت سرکار کو جلسۂ عام میں مکا دکھایا اور اپنے جذبۂ جہاد کا اظہار کیا تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"اگر اعلانِ جنگ ہوا تو بوڑھا بخاری بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے گا۔ مجھے افسوس ضرور ہے کہ میں جوان نہیں لیکن دشمن کے مقابلہ میں جوان ہوں میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے میدانِ جنگ میں جان دوں۔"

امیرِ شریعت کا اپنے رُفقاء کو مشورہ

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب امیرِ شریعت اپنی بیماری اور کمزوری اور دیگر عوارض کی بنا پر ملکی سیاسیات سے الگ تھلگ ہو گئے تو انہوں نے اپنے سیاسی رفقاء کار و احباب کو بلایا اور فرمایا۔

"اگر تم میں سے کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے یا سیاسی مزاج کا مالک ہو تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے"۔ شاہ جی کے اس اعلان و مشورہ کے بعد سیاسی مزاج رکھنے والے حضرات دھڑا دھڑ مسلم لیگ میں شمولیت کرنے لگے، یہ دوسری بات ہے کہ ان کے شایانِ شان حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ اکثریت مسلم لیگ کو چھوڑ کر واپس آگئی اور مجلس احرار کی سیاسی حیثیت بحال کر کے اس پلیٹ فارم سے استحکامِ پاکستان کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

حضرت امیرِ شریعتؒ علماءِ حق کی اس جماعت کے رکنِ رکین اور عظیم فرد تھے جنہوں نے اسلام کی سربلندی اور آزادیٔ وطن کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ اور سالہا سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور اس راہ میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ ہمیشہ صفِ اوّل ہی کے قائدین میں رہے۔ اور ردِّ قادیانیت اور تحفظِ ختمِ نبوت کے لئے تو وہ عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔ جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ حق بات یہ ہے کہ حضرت امیرِ شریعت نے تحفظِ ختمِ نبوت اور ردِّ قادیانیت میں جو کردار ادا کیا وہ بے مثل اور ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے۔ جس کے لئے ربِّ ذوالجلال انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمیں اس پر فخر ہے کہ امیرِ شریعت کے لائق و فائق فرزند مولانا سید عطاء المحسن بخاری دام فضلہٗ مرحوم کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں ان کی بیش از بیش کامیابیوں کے لئے ہماری دلی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

اخذ و ترتیب : حامد سراج

سیّد عطا اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ

۱۹۸۹ء میں مظفر گڑھ میں "خمینی کی موت" کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے شہید ناموسِ صحابہؓ خطیبِ بے مثل، شمشیرِ بے نیام مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ نے دورانِ تقریر امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر اس وقت گفتگو کی جب سامعین میں سے کسی نے کہا کہ آج آپ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی یاد تازہ کر دیں مولانا حق نواز جھنگویؒ نے کہا

"بھائی! امیرِ شریعتؒ کی یادیں کون تازہ کر سکتا ہے؟ آج تک ان کا ثانی نہیں آیا .... شاہ جی جھنگ کے ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ اسی طرح شامیانے لگے ہوئے تھے تیز آندھی آئی لوگ بانس پکڑ کر بیٹھ گئے کہ شامیانے گر نہ جائیں ...... مگر شاہ جی تقریر کر رہے تھے آج بھی وہ لوگ زندہ ہیں۔ جو اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے حلفاً بتلایا کہ شاہ جیؒ تقریر کرتے کرتے یوں سر اوپر کرتے ہیں اور پنجابی زبان میں فرمایا"....... رباّ قرآن نیئوں پڑھن ویندا".... بس گئی آندھی ۔ غائب"

(زور دار نعرے ....عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ..... زندہ باد ...... زندہ باد)

اللہ کبھی کبھی ایسے لوگ پیدا کرتا ہے .... کیا طرزِ زندگی ہے، کیا اندازِ گفتگو ہے اور کیا اندازِ خطابت ہے۔ وہ لوگ بڑے مخلص تھے۔ للّٰہیت کی مجسم تصویر تھے۔

ہمارے جھنگ کے ایک وکیل دوست نے شاہ جیؒ کا ایک واقعہ سنایا کہ الیکشن ہو رہا ہے، ایک امیدوار کی شاہ جیؒ حمایت کر رہے تھے۔ تو دوسرے کی رجو کہ مسلم لیگ کا امیدوار تھا) مولانا حسرت موہانی!

اس دوران ایسا ہوا کہ شاہ جیؒ کے جلسہ میں مولانا حسرت موہانی سٹیج پر تشریف لائے وہ ابھی سٹیج سے پیچھے تھے کہ شاہ جیؒ نے سٹیج چھوڑ کر انہیں گلے لگا لیا، اور سٹیج پر بٹھا لیا۔ وہاں تو

یہ احترام تھا۔

اب شاہ جی اپنے امیدوار کے حق میں تقریر فرما رہے ہیں۔ اور مولانا حسرت موہانی اپنے امیدوار کے حق میں تقریر کر کے آئے ہیں۔ مدِ مقابل (CANDIDATE) ہے۔ یہاں آ کے بیٹھ گئے شاہ جی نے تقریر کے دوران مولانا حسرت موہانی سے کہا مولانا تبلائیے آپ کا CANDIDATE بہتر ہے یا میرا تو مولانا حسرت موہانی نے وہیں کھڑے ہو کر مجمع میں اعلان کیا کہ شاہ جی کا CANDIDATE بہتر ہے۔ میرا غلط ہے .... یہ للٰہیت تھی .... آپ وہ مثالیں کہاں سے لائیں گے یہاں تو تعصب ہے بغض ہے حسد ہے، عداوت اور کینہ ہے، گلہ اور غیبت ہے۔ پتا نہیں کیا کیا غلاظتیں ہیں — ہمارے گندے کردار کو دیکھ کر کہیں لوگ اُن کو بدنام نہ کریں۔ آپ ہمیں ان سے تشبیہ نہ دیں۔ وہ اپنی مثل آپ تھے۔

اظہارِ تعزیت

- مجلس احرارِ اسلام صادق آباد کے مخلص کارکن بھائی غلام مصطفےٰ صاحب کے والدِ ماجد میاں محمد علی صاحب ۸ / جون کو انتقال فرما گئے۔
- بستی دھرانی علاقہ ظاہر پیر میں جماعت کے معاون بھائی محمد اسماعیل گھلیوہ کے والدِ ماجد سیٹھ خدا بخش صاحب ۱۹ مئی کو رحلت فرما گئے۔
- مجلس احرارِ اسلام بہاولپور ڈویژن کے ناظم اعلیٰ جناب حافظ محمد یوسف سیال (احمد پور شرقیہ) ایڈووکیٹ ہائی کورٹ طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔

مجلس احرارِ اسلام کے تمام اراکین و معاونین ان سب بھائیوں کی مغفرت کے لئے دعا فرمائیے اور ایصالِ ثواب کے لئے ختمِ قرآن کریم کا خصوصی اہتمام فرمائیے۔ اللہ جل شانہٗ ان حضرات کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین)

ادارہ نقیبِ ختمِ نبوت کے تمام اراکین، لواحقین کے غم میں شریک ہیں

(اراکین ادارہ)

بقیہ از صفحہ ۲۷

اپنی خوش قسمتی پر نازاں رہے۔ یاد رہے کہ چوکی مستی خان میں مجلس احرارِ اسلام کی باقاعدہ شاخ تھی۔ حاجی گہنے خان بلوچ اور اس کے خاندان کے اکثر افراد شاہ جیؒ سے بیعت تھے۔ اس علاقہ میں [illegible] باوردی سرخ پوشوں پر مشتمل جیشِ احرار بھی تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ، ابراہم لنکن اور پاکستان

مُلتان میں حضرت امیر شریعتؒ تادمِ واپسیں جس مکان میں رونق افروز رہے آپ کا معمول یہی رہا کہ بیشتر وقت "بیٹھک" میں گذارتے۔ بیٹھک کے مقابل کے مکان میں ایک عرصہ کوئی نائب تحصیلدار صاحب مقیم رہے۔ اور ان کے ہاں بھی آنے اور جانے والے کچھ کم نہ تھے۔ سخت گرمیوں میں ایک روز دوپہر کے وقت افسر موصوف کے ایک ملاقاتی ان کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے تھک ہار گئے مگر جواب ندارد! شاہ جیؒ نے دیکھا تو بیٹھک میں بلالیا۔ پنکھے کی ہوا میں کچھ دیر بیٹھے رہنے سے اس کے اوسان بحال ہوئے تو اب اُس نے نظریں گھما گھما کے بیٹھک کے خستہ و شکستہ در و دیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شاہ جیؒ اس کے محسوسات بھانپ گئے اور فرمایا "بھئی تم دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے کہ حکومت نے کیسا عالیشان مکان الاٹ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکان کرائے پر حاصل کیا گیا ہے" مخاطب شاہ جی کے لطیف طنز کو پا گیا۔ اور فوراً بولا، ویسے اگر آپ محسوس نہ فرمائیں تو میں ایک بات عرض کروں، اور اِدھر سے خوشدلانہ اجازت پاکر کہنے لگا کہ

"میرا خیال ہے آپ کے ساتھ ہونا بھی ایسے ہی چاہئے تھا"

شاہ جیؒ پھڑک اُٹھے، مخاطب کو گلے لگالیا اور فرمایا "بھئی بہت خوب! سچ تو یہی ہے کہ جب ہم نے ساری زندگی فرقِ مخالف سے کوئی ادھار نہیں رکھا بلکہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تو اب اُدھر سے التفات اور عنایات کی توقع — چہ معنیٰ دارد؟" اس ساری مکالماتی کارروائی سے ماحول میں بے تکلفی سی پیدا ہوگئی تو بات پاکستان کے سماج اور سرکار کے محاسن و معائب تک پھیل گئی۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ "شاہ جیؒ! مجھے پاکستان کی صورت حال دیکھ کر ابراہم لنکن یاد آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی عادت کچھ ایسی تھی کہ وہ سفارشی حضرات کو کسی دو ٹوک انداز میں حوصلہ شکنی سے بہت کتراتا تھا۔ بلکہ اس کی بجائے سفارشی حضرات کو کسی تمثیلی پیرائے میں ان کا ناجائز موقف باور کرانے کی کوشش کرتا۔ مثلاً ایک دفعہ ابراہم لنکن کو اس کا ایک دوست آکر ملا، اور اپنے ایک دوست کا تعارف کراتے ہوئے ابراہم سے پرزور سفارش کی کہ یار! اِسے وزیر بنا دو، اس پر ابراہم نے حسبِ معمول اپنے دوست سے کہا کہ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ

ایک بادشاہ نے شکار کا پروگرام بنایا اور وزیر اعظم سے کہا کہ نجومی سے زائچہ تیار کر کے بتلاؤ کہ موسم شکار کے لئے ساز گار ہے یا نہیں؟ وزیر اعظم نے تعمیل ارشاد کی اور اطلاع دی کہ حضور موسم بہت ساز گار ہے۔ اب بادشاہ نے مقربین اور مصاحبین کا لاؤ لشکر ترتیب دیا اور سیکڑوں امراء کا یہ قافلہ جنگل کو چل پڑا۔ موسم واقعی خوب تھا۔ مطلع صاف، دھوپ کی تمازت اور تر و تازہ سبزہ! اچانک بادشاہ کی نظر ایک دیہاتی پر پڑی جو اپنے گدھے کو بری طرح پیٹتے ہوئے شہر کو بھگائے لے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی اس حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا تو ایک وزیر نے لپک کر دیہاتی کو جا لیا کہ کیوں بے زبان پر ظلم ڈھاتے ہو۔ دیہاتی نے تنک کر جواب دیا ارے صاحب! زوروں کی بارش آنے والی ہے اور مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کرتے ہیں، بادشاہ نے اسے دیہاتی کی دیوانگی پر محمول کیا مگر ہوا یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں آناً فاناً گھٹا چھا گئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی بادشاہ کو وزیر اعظم پر بے حد و حساب غصہ آیا اور وزیر اعظم صاحب برطرف کر دیئے گئے۔ دوسری طرف دیہاتی کی ڈھنڈیا مچ گئی کہ بادشاہ سلامت اس کی فہم و دانش کے قائل بلکہ گھائل ہو چکے تھے۔ دیہاتی کو حاضر دربار کیا گیا۔ اس نے وزارت عظمیٰ کا پروانہ پایا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھگھیا کر بولا کہ بادشاہ سلامت، یہ کس گناہ کی سزا ہے؟ بادشاہ سلامت فرمانے لگے کہ ہم تمہیں اس کا اہل سمجھتے ہیں اور تمہاری بارش کی پیشگوئی، تمہاری قابلیت کا بین ثبوت ہے۔ دیہاتی بولا! حضور! اگر یہ بات ہے تو وزارت عظمیٰ کا حقدار میرا گدھا ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ جب بھی بارش قریب ہوتی ہے تو گدھا غیر معمولی اچھل کود کا مظاہرہ کرتا ہے اور میں بارش کے امکان سے مطلع ہو جاتا ہوں۔ یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے آج سے ہمارا وزیر اعظم یہ گدھا ہوگا۔ یہ واقعہ سنا کے ابراہیم لنکن نے اپنے دوست کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر وہ مسٹر کہانی کی دلچسپی میں اس بری طرح کھو چکے تھے کہ فوراً بولے پھر آگے کیا ہوا؟ اور ابراہم نے بڑی متانت سے کہا کہ — پھر یہ ہوا کہ اس کے بعد سے دنیا کے ہر گدھے نے وزارت اپنا موروثی حق سمجھنا شروع کر دیا۔ شاہ جی نے حکایت سنی اور کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ مخاطب کو بہت داد دی — کہ پاکستان کی سیاسی صورت حال پر یہ بڑا بلیغ تبصرہ تھا۔ افسوس اس ملاقاتی کا نام حافظہ میں محفوظ نہیں رہا۔

آئندہ شمارہ میں: مولانا محمد عبدالحق حیران کا یادگار مقالہ "جادۂ اعتدال"، ملاحظہ فرمائیں۔ اسنیانِ پاکستان میں رافضی اور خارجی رجحانات کا بھرپور علمی جائزہ، فکر انگیز تجزیہ!

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین
ملتان

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شاعری

خطابت ایک قدیم، مفید، قابل قدر اور عظیم فن ہے۔ اہل یونان اور اہل روم نے اس فن پر بڑی توجہ دی۔ اور بڑے بڑے خطیب پیدا کئے۔ ان کے یہاں خطابت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اہل عرب کو بھی اپنی خطابت پر ناز تھا۔ اہل عرب نے بھی اس فن میں بڑے کمالات دکھائے ہیں اور اس فن کی مبادیات پر بھی لکھا ہے وہ اس فن کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

ابتدا ہی سے یہ فن دینی علماء اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ انہوں نے ہی اس فن کی ترویج و فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیم زمانے میں عوام کے ساتھ رابطے کا مؤثر ذریعہ یہی تھا بلکہ اب بھی یہی ذریعہ مؤثر ہے، اردو فنِ خطابت کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ بلکہ ہمارے یہاں تو یہ فن رُو بہ زوال ہے دینی حلقوں میں بھی کوئی خطیب نظر نہیں آتا۔ اور سیاسی میدان میں بھی زعماء اس فن سے نابلد ہیں اردو فنِ خطابت کی تاریخ میں چند ناموں میں ایک روشن نام سید شرف الدین احمد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ہے وہ اردو کے بے مثال خطیب تھے۔ قدرت نے انہیں خطابت کی بے پناہ صلاحیت عطا کی تھی۔ ان کے معاصر اور ایک بہت بڑے خطیب محمد علی جوہر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ شخص جادوگر ہے۔ اسے تقریر کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ اس کا وجود بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ لوگ اس کی تقریر سے مسحور و مبہوت ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ چاہے تو انہیں اچھائی کے بجائے۔ کسی غلط کام پر بھی آسانی سے آمادہ کر سکتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسے کبھی تقریر نہ کرنے دوں"

ان کے معاصر خطیبوں نے ان کی بے مثال خطابت کو سراہا ہے خطابت اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ دونوں فن ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ خطیب نثر میں شاعری کرتا ہے وہی نثر جب موزوں ہو جائے تو شاعری بن جاتی ہے خطیب اپنی تقریر کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے شاعرانہ ہنر سے کام لیتا ہے۔ اس لئے ایک اچھے خطیب کے اندر ایک اچھا شاعر پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شعر فہمی اور شعر گوئی بھی علماء کی روایت رہی ہے عمر خیام جب رصدگاہ کے کام سے تھک جاتا تو رباعی کہہ لیتا، ابن سینا بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ خطیبِ بے مثل تھے۔ اسی ناطے سے ان میں ایک شاعرِ بے مثل پوشیدہ تھا۔ مگر انہوں نے شاعری کے فن کو

اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس پر توجہ دی، وہ اعلیٰ شعری ذوق کے مالک تھے۔ بچپن کی شعری مجالس نے اس ذوق کی تربیت کی مگر آپ نے باقاعدہ طور پر شاعری نہیں کی۔ بلکہ کہیں کہیں کسی خاص تحریک و ترغیب کے زیرِ اثر اشعار کہے۔ اور نذیر تخلص اختیار کیا۔

ان کے اشعار کا ایک مجموعہ "سواطع الالہام" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سواطع الالہام فیضی کی تفسیر غیر منقوط کا نام ہے۔ چونکہ شاعری کو بھی الہامی سمجھا جاتا ہے۔ اور ساطعہ بجلی کی چمک کو کہتے ہیں اس رعایت سے یہ نام بہت موزوں ہے۔ جب کسی الہام کی بجلی چمکی اس کے نتیجے میں جو شعر ہوا وہ ساطعہ ہے۔ یوں اس مجموعے میں بہت سے ساطعات جمع ہو گئے ہیں۔

اس مجموعے میں تین زبانوں میں اشعار موجود ہیں۔ یعنی فارسی، اردو اور سرائیکی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو ان تین زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس مجموعے کے فارسی اشعار میں فکری گہرائی بہت زیادہ ہے اظہار کی مؤثر ہے اور اسلوب بھی سلیس ہے۔ ایک نعت کے چند اشعار دیکھئے:

لولاک ذرہ ز جہانِ محمد است
سبحان من یراہ چہ شان محمدؐ است

سیپارۂ کلامِ الٰہی خدا گواہ
آں ہم عبارتے ز زبان محمدؐ است

نازد بنام پاک محمدؐ کلام پاک
نازم بآں کلام کہ جان محمدؐ است

توحید را کہ نقطۂ پرکارِ دینِ ماست
دانی کہ نقطۂ ز بیان محمدؐ است

چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

بیا کہ با تو سخن ہا ز حرف لولاک است
بیا کہ با تو حکایت ز قدر افلاک است

یتیم مکہ محمدؐ کہ آبروئے خدا است
کسیکہ خاک رہش نیست بر سرش خاک است

ہزار لشکرِ طاغوتیاں زند بر ہم

قیامتے کہ بیا از نگاہِ بیباک است

گرہ بطرّہ ما زاغ و ما طغیٰ بستند،

ولے زسر تاجِ ماعرفناک است

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نعتیہ اشعار سے ان کی حضورؐ سے محبت اور عقیدت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے اس کے ساتھ فکری گہرائی اور فنی محاسن اپنی جگہ پر ہیں۔ شاہ صاحب کی فارسی شاعری بہت خوب صورت ہے جس سے ان کی قدرتِ بیان ظاہر ہوتی ہے۔ وحدت الوجود فارسی اور اُردو کی صوفیانہ شاعری کا مقبول ترین مضمون ہے شاہ صاحب نے بھی اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے۔

وحدت بوجود و حالتِ کثرت درآمدہ

حرکت بجلوہا جلوہ بحرکت درآمدہ

موسیٰ و طور و وادیٔ ایمن حرا حرم

ہر جا کہ دیدہ ایست بحیرت درآمدہ

چمن چمن گل و نسرین زعکسِ رخ ریزد

سبد سبد گل خنداں زراہ می چکدش

اب اُردو میں اس مضمون کو دیکھئے :۔

ذرّوں سے تا بہ مہر ستاروں سے تا چمن

عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست

تصوف کے حوالے سے فقر کا مضمون بھی شاعری کا موضوع بنا ہے، شاہ صاحب نے بھی اسی پر اشعار کہے ہیں، ملاحظہ کیجئے :۔

یک نانِ جویں زخوانِ شاہی خوشتر

از چنگ و رباب آہ صبحگاہی خوشتر

یک لحظہ بزیرِ سایۂ قدِ یار،

واللہ! زہزار چترِ شاہی خوشتر

ان کی فارسی شاعری فارسی کے روایتی تغزل سے معمور ہے :۔

ہان لالہ ز غم خون شد داز ہجر سمن زرد است

این دیدۂ احمر ہم داین چہرۂ اصفر ہم

دردِ جگر دارد بیمار غمت نیسانہ

خواہد نہ مداوائے جوید نہ گہے مرہم

پارسایان ہمہ ناز ند بہ زہد و طاعت

یک ندیم است کہ بر دامن تر می نازد

شاہ صاحب کی اردو نظمیں ہنگامی موضوعات پر ہیں۔ ہنگامی موضوعات پر ہونے کی وجہ سے یہ نظمیں ہلکی پھلکی ہیں۔
اور بعض میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ ان نظموں میں روانی کمال کی ہے ایک نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے :۔

دن کو پوچھو، رات کو پوچھو
رنگ برنگی دھات کو پوچھو
مٹی پتھر پات کو پوچھو
ایک نہ پوچھو سات کو پوچھو
تم کیسا جانو اے نادانو!
تم کیا سمجھو تم کیسا جانو!

ان نظموں کے علاوہ شاہ صاحبؒ کی فردیات قابلِ توجہ ہیں :۔

یہ چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

یہ شعر وطن کے حالات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ شعر ساحر لدھیانوی کو دے دیا تھا۔
اور اب یہ شعر ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" کی زینت ہے۔
چند اور فرد ملاحظہ کیجئے۔

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں
ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہے۔

ہ گر ہو دوائے عشق کی تلخی نصیبِ عقل
بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

ہ سب سے پہلے حسن کی رعنائیاں ناپی گئیں
پھر ہمارے عشق کی پہنائیاں ناپی گئیں

ان اشعار سے شاہ صاحب کی شعر گوئی کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی، اور وہ اُردو کی کلاسیکی شعری روایت سے واقف بھی تھے۔ اگر شاہ صاحب اس فن پر بھی کچھ توجہ صرف کرتے تو اردو کو ایک اور اچھا شاعر مل جاتا۔ مگر انہوں نے اس فن پر کیوں توجہ نہیں دی اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ان میں سے بعض پر قیاس آرائی ممکن ہے۔ بہرحال یہ مختصر سا مجموعہ ان کی شعر فہمی اور شعر گوئی کے اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔

برجستگی

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۵۲ء میں کراچی تشریف لے گئے قیام مجلسِ احرارِ اسلام کے دفتر میں ہی رہا۔ ایک روز صبح ہی صبح عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری (مرحومین) دفتر چلے آئے۔ شاہ جیؒ اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ سالک نے چھوٹتے ہی پھبتی کسی

ع برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر

شاہ جیؒ نے تسبیح مکمل فرمائی اور برجستہ فرمایا "میں تم دونوں کا ہی تصوّر کر رہا تھا"!

مجید لاہوری (مرحوم) کے نام پیغام —— جریدہ کی کامیابی پر!

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کا "نمکدان" فواحشات سے پاک ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اسے ترقی دے۔ ہم اسے گھر میں بھی پڑھ لیتے ہیں۔ رہی آپ کی کراچی میں مکان نہ ملنے کی شکایت —— ؟ تو کراچی والوں نے کوئی ایسا مکان نہیں بنایا جس کے دروازے سے آپ داخل ہو سکیں[1]!"

(امیرِ شریعت) سید عطاء اللہ شاہ بخاری

---

[1] مرحوم مجید لاہوری کی "دیو قامتی" کی طرف اشارہ ہے۔

خادم حسین

زبان میری ہے بات اُن کی

——— فوج چاہتی تھی کہ سندھ میں جن ملزموں کو وہ پکڑے ان کو فیصلے تک ضمانت پر رہا نہ کیا جائے (غلام سرور چیمہ وزیر مملکت)

اور آپ اپنے جیالوں کو فوج کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔

——— ممتاز راٹھور کی بے نظیر سے ملاقات۔ (ایک خبر)

بدھو میاں بھی محترمہ باندی کے ساتھ ہیں

گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

——— یوم سیاہ منانے والوں کے مقابلے میں قرآن و سنّت پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ (طارق رحیم)

اسی لئے تو شراب کے زیادہ لائسنس آپ کے دور میں جاری کئے گئے ہیں۔

——— قرض لینا سنّتِ نبوی ہے۔ (طاہر القادری)

اور قرض لے کر بجارو، کلاشنکوف اور باڈی گارڈ رکھنا سنّتِ "نقوی" !

——— قائدِ اعظم پاکستان کو صرف مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے حاصل کر کے اسے سیکولر ملک بنانا چاہتے تھے (سردار شوکت حیات۔ ہفت روزہ ثالث)

پھر وہ دو قومی نظریہ کیا تھا — سردار صاحب گھڑی دیکھیں، بارہ تو نہیں بج رہے!

——— ہم کسی عالمِ دین کو اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہماری نمائندگی کرے۔ (ایک مغرب زدہ چھنال)

آپ کی نمائندگی تو اُس بازار کا دلّال ہی کر سکتا ہے جناب!

——— بے نظیر ہمیشہ اپنے وعدوں سے ہٹ جاتی ہیں۔ (مولانا فضل الرحمٰن)

ساون کا مہینہ ہے ——— ساجن سے جدا رہ کر جینا کوئی جینا ہے!

——— شریعت بل اور شریعت محمدیؐ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ (فیصل صالح حیات)

نہیں نہیں۔ شریعت بل اور فقہ جعفریہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

——— اللہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے اور پارلیمنٹ اس کے نائبین پر مشتمل ہے۔ (بے نظیر)

اللہ کے "نائبین" ۔ بے نظیر، نصرت بھٹو، طارق رحیم، جہانگیر بدر، آصف زرداری،

افتخار گیلانی، اشرف عباسی، ریحانہ سرور، خان بہادر، یحیٰ بختیار، ممتاز اعوان۔ فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰان !

—— اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے نسیم احمد قادیانی انتقال کر گئے۔ (ایک خبر)

خس کم جہاں پاک !

—— جب ہماری باری آئی، انکوائری ختم کر دی گئی۔ (طاہر القادری)

ساڈی واری آئی تے بدھو رہ پیا !

—— وفاقی حکومت شریعت بل کے خلاف تحریک چلائے گی۔ (ایک خبر)

کیونکہ شریعت بل سے وفاقی حکومت کی حرام زندگیوں پر زد پڑتی ہے۔

—— پاکستان چار سانڈوں میں گھرا ہوا ہے۔ رستہ کوئی مدبّر حکومت ہی نکالے گی۔ (ولی خان)

نہیں۔ رستہ کوئی مدبرہ بھینس ہی نکالے گی۔

—— وزیر اعظم بے نظیر کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف میں حاضری۔ (ایک خبر)

مکے گئی مدینے گئی۔ کربلا گئی۔ جیسے گئی تھی ویسے ہی چل پھر کے آ گئی۔

—— گورباچوف کی والدہ نے رنگین ٹی وی خرید کر لیا (ایک خبر)

پاکستان کے اشتراکی کوچہ گردوں کو مبارک !

—— کابینہ نے خواتین کی فیڈرل پولیس فورس بنانے کی منظوری دے دی۔ (ریحانہ سرور)

روزانہ سروس پہ رہنے والی مردانہ پولیس کے لئے خوشخبری !

—— موجودہ حالات میں شریعت کا نفاذ نفاق کا باعث ہوگا۔ (معراج محمد خان)

اپنا نام معراج محمد خان کی بجائے نفاق نظیر خان رکھ لیں تو بہتر ہے۔

—— بازار میں پیدا ہونے میں کسی کی مرضی کا دخل نہیں یہ صرف خدا کی مرضی پر منحصر ہے کہ کون کہاں جنم لے گا۔

(اداکارہ محترمہ گوری صاحبہ)

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی جب گوری بازار سے نہیں نکلے گی تو اور گوریاں جنم لیتی رہیں گی۔

—— صدر غلام اسحاق خان کو صدر بش کی عید مبارک۔ (ایک خبر)

عید مبارکاں ... ؟ خطرہ ... خطرہ ... خطرہ

—— شریعت بل کے ذریعے ملاؤں کو اتھارٹی دی جارہی ہے۔ (مبشر حسن)

اور جمہوریت کے ذریعے بدمعاشوں کو اتھارٹی دی جا چکی ہے۔

——— زمانہ جاہلیت کے بے اصول عرب قبائل بھی محرم الحرام کا احترام کرتے تھے۔ (بے نظیر)
کیا اسی طرح جس طرح آج ایرانی دھرم کے پجاری دہشت گردی کا بازار گرم کرتے ہیں؟

——— ۱۴۱۱ھ سالِ نبی کے طور پر منایا جائے گا۔ (خان بہادر)
کبھی شیشے میں اپنی شکل دیکھی ہے جناب۔ خانہ احب؛

——— ہم انسانوں کے ہاتھ، کان کاٹنا مناسب نہیں سمجھتے۔ (بے نظیر)
پھر تو بی بی! آپ نے "بلا دل" کے ختنے بھی نہیں کروائے ہوں گے!

——— جو بھی راہ میں آئے گا، ٹھوکر مار کر ہٹا دیں گے۔ (اعجاز الحق، ہمایوں اختر)
۵ راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے ۔ شہر میں ڈھیر نہ لگ جائیں گریبانوں کے

——— پیپلز پارٹی میں کوئی مائی کا لال بے نظیر کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ (راؤ سکندر)
آمریت اسی کو کہتے ہیں۔

——— سردار ابراہیم میرے باپ کی طرح ہیں۔ وہ جو نہ بلائیں، تعمیل ہوگی۔ (ممتاز راٹھور)
آخر یہی ہونا تھا ——— ہم کو یوں ہی ہنسنا تھا، تم کو یوں ہی رونا تھا!

——— میری حکومت دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کوشاں ہے۔ (بے نظیر)
یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شمر کربلا گامے شاہ میں مجلس پڑھ رہا ہے۔

——— خاتون ڈرائیور نے کانسٹیبل کی جان لے لی۔ (ایک خبر)
تھانوں میں خواتین کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا انجام!

——— فرانس کا پانی پینے والے غریبوں سے سوکھا ٹکڑا بھی چھین رہے ہیں۔ ۲۵ لاکھ کا باورچی خانہ اور دس ہزار ڈالر کا بیڈ بنانے والے غریبوں کے ترجمان بن گئے ہیں۔ (شیخ رشید)
۵ رُتوں پہ بس نہ چلا ورنہ یہ چمن والے فضائیں بیچتے ۔ نیلام رنگ و بو کرتے!

بقیہ از صـ ۶۲

کرتے ہوئے کہا۔ حافظ جی ایک بہترین فٹ بالر تھے۔ فٹ بال کے کھیل کے فروغ اور نوجوان نسل کی اصلاح کے لئے مرحوم کی یاد ہمیشہ کھلاڑیوں کے دلوں میں آباد رہے گی۔ ہم کھیل کے میدان میں حافظ جی مرحوم کی کمی شدت سے محسوس کرتے رہیں گے۔

سید محمد ارشد بخاری (ایڈووکیٹ)
احمد پور شرقیہ - ضلع بہاولپور

مجلس احرارِ اسلام کے راہنما
حافظ محمد یوسف سیال ایڈووکیٹ انتقال کر گئے

عالمی مجلس احرارِ اسلام پاکستان ضلع بہاول پور کے ناظمِ اعلیٰ اور احمد پور شرقیہ کے مشہور دینی و قومی نوجوان راہنما حافظ محمد یوسف سیال (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ) بقضائے الٰہی انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

محمود پارک احمد پور شرقیہ میں مرحوم کی نماز جنازہ جانشینِ امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں علماء، وکلاء، اطباء، سیاسی و سماجی راہنما، کاروباری حضرات اور کھلاڑیوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی نماز جنازہ کے بعد مرحوم کے جسد خاکی کو آہوں سسکیوں کے ساتھ قبرستان عظمت سلطان میں دفن کیا گیا۔ حافظ محمد یوسف سیال مرحوم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور ملنسار سیاسی و سماجی راہنما تھے۔ انہوں نے اسلامیات اور سیاسیات میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کا تحفظ ان کا جزوِ ایمان تھا۔ وہ خاندانِ امیر شریعت سے دلی لگاؤ رکھتے تھے اور مجلس احرارِ اسلام کے دیرینہ حقیقی جاں نثار کارکن تھے۔ وہ فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے۔ مرحوم کا مذہبی، سیاسی و تاریخی مطالعہ وسیع تھا، وہ اپنے پیچھے ایک بہت بڑی لائبریری چھوڑ گئے ہیں ان کی لائبریری میں کوئی ایسی کتاب نہیں جو مرحوم نے نہ پڑھی ہو۔ جونہی مرحوم کی موت کی خبر شہر میں پہنچی احمد پور شرقیہ میں اداسی اور ویرانی چھا گئی۔ عدالتوں میں وکلاء اور جج صاحبان نے کام بند کر دیا۔ مرحوم کے دوست اور رشتہ دار زار و قطار رونے لگے، مرحوم احمد پور شرقیہ کے دینی و سیاسی کارکن سید محمد ارشد بخاری ایڈووکیٹ کے بہترین دوست اور رفیق کار تھے۔ واضح رہے کہ گذشتہ سال مرحوم کے دونوں گردے کام چھوڑ گئے تو راولپنڈی کے مشہور ماہر امراض گردہ ڈاکٹر کرنل مختار حامد شاہ نے مرحوم کے بڑے بھائی محمد یونس سیال کا ایک گردہ مرحوم کو آپریشن کے ذریعہ لگایا جس سے مرحوم صحت یاب ہو گئے لیکن دو ماہ قبل مرحوم کو یرقان کا حملہ ہوا۔ اور دو ماہ علاج معالجہ کے بعد کڈنی سنٹر راولپنڈی میں ۲۱ جون کو دن کے ۲ بج کر دس منٹ پر اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی، مرحوم ہمہ صفت موصوف تھے۔ خاندان اور دوستوں میں مرحوم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ محمد یوسف سیال مرحوم نے تحریک بحالی صوبہ بہاول پور، تحریک تحفظ ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفےٰ میں بڑھ چڑھ

کر حصہ لیا۔ وہ ۱۹۷۰ء میں تحریک بحالی صوبہ بہاول پور کے دوران پابندِ سلاسل بھی رہے۔ مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کی خاطر مورخہ ۹۰-۷-۲۴ بروز منگل صبح سات بجے مسجد غوث شاہ احمد پور شرقیہ میں قرآن خوانی کی گئی۔ جس میں مرحوم کے دوست، رشتہ داران، اساتذہ، سیاسی و سماجی راہنماؤں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

مرحوم کے مشفق استاذ ممتاز عالمِ دین علامہ مولانا محمد عبداللہ صدر مدرس عربیہ فاضل ہائی سکول نے حافظ صاحب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:۔

مرحوم سراپا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے نبیٔ آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز ختم المرسلین کے تحفظ اور مرزائیت کے خلاف مرحوم کی جدوجہد ناقابلِ فراموش ہے، مولانا نے فرمایا مرحوم اساتذہ کے پیارے شاگرد تھے اور میرے لئے بیٹوں کی مانند تھے۔ بڑھاپے کے اس دور میں دین کے جذبات سے سرشار ایسے نوجوان کو دیکھ کر ہماری یاس آس میں بدل جاتی تھی۔ مرحوم کا شاندار جنازہ اس کی بخشش کی دلیل ہے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب نے مرحوم کی عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی خاطر جدوجہد کا بطورِ خاص ذکر کیا اور کہا۔ مرحوم کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص محبت تھی، مرزائیت کے خاتمہ کے لئے مرحوم کا شاندار کردار ناقابلِ فراموش ہے، دوستوں اور رشتہ داروں میں مرحوم کی نمایاں حیثیت پھولوں کے ہار میں درمیان والے بڑے پھولوں کی سی تھی۔ آخر میں مولانا نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اس موقع پر مرحوم کے دوست، شاگرد اور کھلاڑی زار و قطار رو رہے تھے۔ مرحوم کی تعزیت کے لئے ان کے دوستوں اور سیاسی راہنماؤں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔

احمد پور شرقیہ کے سول جج صاحبان میاں مقصود احمد بھٹو، عبدالرحمٰن اعوان، راؤ آفتاب احمد خان ممبر صوبائی اسمبلی سردار محمد عبداللہ خان

ڈاہر، اسسٹنٹ کمشنر سردار غلام نبی خان، پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی راہنما سابق رکن پنجاب اسمبلی جناب سید تابش الوری تحریک استقلال کے راہنما ساجد فیروز ایڈووکیٹ۔ ڈویژنل فٹ بال ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری قاری انوار الحق عالمی مجلس احرارِ اسلام خان پور کے صدر مرزا عبدالقیوم بیگ نے مرحوم کے لواحقین اور ان کے قریبی ساتھی سید محمد ارشد بخاری ایڈووکیٹ سے تعزیت کی اور دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ سردار محمد عبداللہ خان ڈاہر ممبر صوبائی اسمبلی نے کہا، مرحوم ایک خوش اخلاق اور ملنسار نوجوان راہنما تھے وہ شرافت کا مجسمہ تھے۔ ممتاز مسلم لیگی راہنما جناب سید تابش الوری نے کہا:۔ حافظ جی کی موت پر مجھے جو دلی دکھ ہوا ہے۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک مخلص اور جانثار دوست تھے۔ مرحوم کا مذہبی اور سیاسی کردار شاندار تھا۔ ہم ایک باشعور اور وفادار ساتھی سے محروم ہو گئے ہیں۔

ڈویژنل فٹ بال ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری قاری انوار الحق نے سپورٹس کے میدان میں مرحوم کی خدمات کا اظہار

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر)

صادق آباد

چودھری بشارت علی

دین دشمنوں کو شکست دینے کیلئے بنیاد پرست مومن بن جائیے

صادق آباد میں مدرسہ و مسجد ختم نبوت کی افتتاحی تقریب سے سید عطاء المؤمن بخاری کا خطاب

مجلس احرار اسلام کے اکابر ایک عرصے سے اس بات پر شدت سے زور دے رہے ہیں کہ جہاں جہاں جماعت کی شاخیں قائم ہیں وہاں جماعت کے اپنے مراکز قائم کئے جائیں۔ اس کے دور رس نتائج حاصل ہوں گے اوّلاً اپنے موقف کے اظہار کے لئے اپنے مرکز سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ برملا دعوت و تبلیغ کا اہتمام کر سکیں گے۔ اور غیروں کی احتیاج بھی باقی نہیں رہے گی۔ ثانیاً جماعت کی سرگرمیوں میں وسعت اور تنظیم پیدا ہوگی اور یکسوئی کے ساتھ تحریکی عمل کو تیز تر کرنے کا موقع میسر آئے گا۔

الحمد للہ! الوقت آٹھ دینی مدارس و مراکز ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری مدظلہٗ کی سرپرستی اور جماعت کے شعبۂ تبلیغ تحریک تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام ملک کے مختلف حصوں میں سرگرم عمل ہیں۔ علاوہ ازیں برطانیہ کے مختلف شہروں میں محاسبۂ مرزائیت کے سلسلہ میں "احرار ختم نبوت مشن" سرگرم عمل ہے۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ صادق آباد کے احرار کارکنوں نے بھی اس طرف بھرپور توجہ مرکوز کر دی ہے۔ اور "مسجد و مدرسہ ختم نبوت" کے نام سے جماعت کا نیا مرکز قائم کر دیا ہے۔

۲۲ مئی کو مسجد و مدرسہ کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ مجلس احرار اسلام کے مرکزی نائب صدر ابن امیر شریعت سید عطاء المؤمن بخاری اس تقریب کے خاص مہمان تھے۔

حافظ علی احمد نے تلاوت کلام مجید سے تقریب کا آغاز کیا، محمد جمیل صاحب نے بارگاہ ختم المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہدیۂ نعت پیش کیا۔ جامع مسجد ختم نبوت کے خطیب مولانا قاری عبید الرشید احرار کی مختصر تعارفی تقریر کے بعد حضرت شاہ جی مدظلہٗ نے درس قرآن کریم ارشاد فرمایا۔ آپ نے فرمایا جب سے مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنی عملی زندگی سے خارج کیا ہے وہ فتنوں اور انتشار و افتراق میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں

کو یہی حکم فرمایا ہے کہ وہ قرآن کریم میں غور و تدبر اختیار کریں۔ یہی فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ قرآن نے امتِ مسلمہ کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے محبت و اخوت کے پاکیزہ رشتے سے منسلک کر دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حیاتِ طیبہ قرآن کی عملی تفسیر ہی تو ہے! آپ علیہ السلام نے یہی قرآن اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سینوں میں اتارا تو وہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونۂ کامل بن گئے۔ اسی قرآن پر عمل کرنے کی بدولت اللہ جل شانہٗ نے ان سے حسنِ آخرت کا وعدہ فرمالیا پھر اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ خود فرمائیں کہ "میں نے ان کے دلوں میں ایمان کو مزین کر دیا"

شاہ جی نے کہا کہ آج ہم جن حالات سے دوچار ہیں یہ سب قرآن کریم سے بغاوت، سنتِ رسول علیہ السلام سے انحراف اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام و منصب کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ اللہ کا عذاب نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ آج مسلمان مسلمان کو قتل کر رہا ہے۔ سندھ میں مسلمان کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اس نے انسانیت کے تمام تقاضوں کو پامال کر دیا ہے۔ قوم نے قرآن کو چھوڑا تو پھر لادین جمہوری نظام کے ظلم و استبداد کا شکار ہو گئی۔ دینِ فطرت کو نظر انداز کیا تو خلافِ فطرت نظام کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ باحیا، شریف، غیرت مند اور سچے مسلمان رہنماؤں کی تذلیل کر کے انہیں دھتکارا تو چوروں، ڈاکوؤں اور زانیوں، شرابیوں کی حکومت کے غلام ہو کر رہ گئے۔ اسلام کے نام پر ملک بنا کر اسلام سے انحراف کیا تو اپنی عزت اور شناخت کھو گئے۔ اپنا مشرقی بازو ہار گئے۔ سید عطاء المؤمن بخاری صاحب نے فرمایا کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اگر آج بھی ہم سچے دل سے توبہ کر کے اللہ کی نصرت طلب کریں تو اس کا وعدہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ یہ وقت بڑا نازک ہے حالات کی سنگینی، قتل و غارت گری، اور پریشان حالی کا ایک ہی حل ہے کہ قرآن کریم میں غور و تدبر، سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تحفظ کے لئے بیدار ہو جانا چاہئے۔ بنیادی عقائد کے تحفظ کے لئے جدوجہد تیز کر دینا چاہیئے۔ اور اپنی سیرتوں کو اسوۂ حسنہ سے ہم آہنگ کرنے کی محنت کرنی چاہیے۔ جب تک مسلمانوں میں دین کے اظہار کے لئے جرأت و بے باکی اور جذبۂ جہاد پیدا نہیں ہوتا موجودہ پستی سے نجات ممکن نہیں۔ اب تو بہر حال طاقت کا استعمال ضروری ہو گیا ہے۔

جب بے دین باطل کے اظہار میں بے خوف ہو گیا ہے۔ تو دین والوں کو نام نہاد رواداری اور معذرت خواہانہ رویوں کو بہر صورت ترک کر دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ رواداری بے غیرتی کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان جب تک ایمان و عقائد کے معاملہ میں ایک سچے نبی پرست مؤمن کا کردار ادا نہیں کریں گے ملک کے باطل اور کفریہ جمہوری نظام میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

وضاحت ۔ تبصرہ

عزیز مکرم سید کفیل بخاری صاحب!

فقیر کا جو طویل مضمون بعنوان "جاہلانہ وضاحت کی عالمانہ وضاحت" ماہنامہ نقیب ختم نبوت بابت ماہ جون ۹۰ء میں چھپا، اس میں کچھ اداراتی اور کتابتی اغلاط آگئی ہیں۔ جن کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ مثلاً ۔ اس مضمون کے صلا اور ص۳۶ میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے یوں لکھا گیا کہ......

"یہ مضمون حضرت اقدس مولانا خان محمد صاحب دامت معالیہم کے حکم خاص اور ارشاد پر لکھا گیا"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت اقدس نے اس مضمون کے متعلق فقیر کو ایک حرف بھی ارشاد نہیں فرمایا۔ حضرت اقدس کا ارشاد تو ایک اور امر واقعہ کے لئے تھا کہ — "شاہ صاحب کی مکمل امداد کریں —"

اس لئے یہ وضاحت فوراً شائع کر دیں ۔ اور کتابتی اغلاط کی تصحیح بھی ضرور شائع کریں ۔

جولائی کے "نقیب ختم نبوت" میں شاہ بلیغ الدین صاحب کا مضمون عمدہ ہے ۔ اسی شمارہ میں غزوہ قسطنطنیہ پر مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی عبارت امارت یزید کے متعلق پھیسی ہے ۔ جب متن بخاری میں ..... ویزید بن معاویۃ علیھم بارض الرّوم .....
اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں فانہ (یزید) کان امیر ذالک الجیش بالاتفاق ..... لکھ دیا ہے تو پھر یہ پھپھسا پن محض "حسن ظنیت" ہے ۔

عطاء المحسن شاہ صاحب سے سلام عرض کر دیں ۔

والسلام
فقیر محمد شمس الدین عفی عنہ
از درویش ڈاک خانہ ہری پور ہزارہ

تصحیح نامہ

برائے مضمون "جاملانہ وقاحت کی عالمانہ وضاحت"

(نقیب ختم نبوت جون ۱۹۹۰)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱	۱۹	واوّل من استدل بہ	کا حوالہ ـ فیض الباری ج ۱ ص ۴۳ (طبع مصر)
۱۶	۱۴	مسئلہ پالش	مسکہ پالش
۱۷	۲۳	مطبوعہ	طبع ہشتم
۱۷	۲۳	ص ۳۶۷	ص ۲۸۹
۱۷	۲۶	ص ۳۷۵	ص ۲۹۵
۱۸	۹	تفسیری ادب	تعبیری الادب
۱۹	۵	کتاب میں تھی	کتاب میں نہ تھی
۲۱	۲۷	جلد ۷	جلد ۶
۲۴	۱۱	لم یفاق الجماعۃ	لم یفارق الجم
۲۴	۲۷	کے ذمہ میں	کی مذمت میں
۲۸	۱۹	موقع	توقع
۳۰	۱۶	وانہ ہذا الحدیث	وآفۃ ہذا الحدیث
۳۲	۳۱	والاسلام لیسیرہ	والاسلام ان لیسیرہ
۳۳	۱۰	ولابنہ	وابنہ
۳۳	۲۲	معاویہ بن حرب	معاویہ بن صخر بن ح
۳۳	۲۲	ص ۱۲۶	ص ۲۲۶
۳۳	۲۴	ص ۱۳۶	ص ۲۳۶
۳۳	۲۷	رضی اللہ عنہا	رضی اللہ عنہ
۳۴	۱۷	ایرانہ میں ادبیات	ادبیات ایران
۳۵	۲۰	ذوالبادیہ	ذوالہاویہ
۳۶	۲۷	واللہ سبحانہ	وللہ سبحانہ

زبانِ خلق

مکرم و محترم شاہ جی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ماہ جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مسئلہ کشمیر پر امام اہلِ سنت مولانا مفتی محمد اسحاق صدیقی مدظلہ کا تحقیقی جائزہ پر مبنی تحقیقی سچا کھرا مضمون ملاحظہ ہوا جس میں سبائیوں کی خطرناک سازشوں کو عریاں کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت مولانا ممدوح کو صحت و سلامتی نصیب فرمائیں (آمین) دینی لحاظ سے موصوف کا وجود ملتِ اسلامیہ کے لئے بہت مفید اور باعثِ برکت ہے۔ آپ کے خلاف ہزار ہا صفحات پر مشتمل تصانیف آپ کی علمی وجاہت اور علمی وقار کو ہرگز ہرگز مجروح نہیں کر سکتیں "خارجی فتنہ" نامی لایعنی کتاب کی متعدد جلدیں نہ تو آپ کی عزت و عظمت کم کر سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کی علمی رفعتِ شان کا مقابلہ! مولانا کے مقابل ان کی حیثیت "آئیں، بائیں، شائیں" سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مدظلہ کو سبائیت کے رد میں مزید ٹھوس علمی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

آنجناب کی طرف سے "چند غلطیوں کا جواب" کے زیرِ عنوان "دار العلوم" اور دیوبند کی وضاحت واقعتاً مبنی برحقیقت ہے۔ راقم اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ نے اکابر علمائے دیوبند کا ہمیشہ بے لوث اور ڈٹ کر دفاع کیا ہے۔ خصوصاً بانیٔ دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، خاتم المحدثین علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اموی، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور دیگر اکابر سے متعلق آپ نے اپنی سیکڑوں تقاریر میں ان کی اولوالعزمی، دین کی بے لوث خدمت اور مجاہدانہ کارناموں پر انہیں زبردست خراجِ تحسین اور ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے۔ ان پر ناجائز نکیر کرنے والوں کو مضبوط لگام دی ہے جو سبائیت زدہ نام نہاد دیوبندگو کے بس کا روگ نہیں ہے۔

بے شک دیوبند شہر میں دار العلوم کے علاوہ دیوی بن بھی ہے، اس کا پوجا ہوتی ہے اور وہاں مشرکوں کا ڈیرہ ہے۔ مگر دیوبند میں علمائے حق کا مدفن بھی ہے جہاں کفار رہتے ہیں وہاں اولیاء اللہ اصحابِ علم و عمل حضرات کی سکونت بھی ہے بعض لوگ عرفِ عام میں "دیوبند" سے ان علماءِ حق کی وجہ سے بغض و حسد رکھتے ہیں "دیوی بن" کی وجہ سے نہیں "دیوبند" سے ہماری نسبت بھی ان علماءِ حق کی محنت اور دین کے لئے شاندار خدمات کی وجہ سے ہے۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ دیوبند "دار الحرب" میں ہے۔ آپ کا موقف بھی مبنی برحقیقت ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ علماء دیوبند کی نمائندگی کے نام نہاد دعویدار چند تنگ نظر اور کوتاہ اندیش لوگوں کے رویوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی سابقہ وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے "دیوبند" سے متعلق خاص جملے کو قلم زن کر کے حاسدین و خاسرین کی دراز زبانیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گے۔

والسلام

نیاز کیش حافظ ارشاد احمد دیوبندی ، ناظم افضل حق لائبریری

ظاہر پیر

گرامی قدر شاہ جی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

چکوالی فرقہ کے بزرجمہر ہمارے پیچھے تو عرصہ دراز سے اندھے کی طرح لٹھ لے کر پڑے ہوئے ہیں اور ہمیں خارجی ثابت کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کئے ہوئے ہیں ۔ لیکن یہ جان کر دلی افسوس ہوا کہ آپ بھی ان کی زد میں آ گئے ۔ اور آپ کے خاندان بنی ہاشم کو بھی خارجیت کی تہمت کے تمغہ سے نوازا گیا ہے ۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، دراصل ان لوگوں کو اپنے سوا سب خارجی نظر آتے ہیں

ع اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اللہ تعالیٰ اس فتنہ کے شر سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے ۔ اور آپ کو ان کے تعاقب و محاسبہ کی مزید قوت عطا فرمائے ۔ (آمین)

والسلام

حافظ فیض الرحمٰن صدیقی

ابن حکیم فیض عالم صدیقی شہیدؒ —— جہلم ——

محترم و مکرم ! السلام علیکم

"نقیب ختم نبوۃ" جون کا شمارہ انتہائی اہم تھا۔ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب کا مقالہ" جاہلانہ وقاحت کی عالمانہ وضاحت" انتہائی جامع ، مدلل اور پر مغز تھا جس میں ایک بھی فقرہ بغیر دلیل کے (QUOTE) نہیں کیا گیا۔ انتہائی اعلیٰ ظرفی اور عالمانہ طرزِ گفتگو کے ساتھ قاضی مظہر حسین کے چکوالی فتنہ کا (OPERATION) کیا گیا ہے ۔ اب تمام اہلِ سنت کے لئے بھی ضروری ہے کہ "سن من" کی بجائے "سن گن" سے کام لیں اور تاریخی حقائق کو اپنی تقاریر، تحریروں اور نجی محفلوں میں ببانگِ دہل ڈنکے کی چوٹ برسرِ منبر بیان کریں ۔ رافضیت کی پیروی چھوڑ کر عوام الناس کو بتائیں کہ صحابہ کا مرتبہ و مقام کیا تھا۔ اور ان کے مرتبہ و مقام بیان کرنے سے سیدنا حسین رضؓ کا مقام کم نہیں بلکہ اور بلند ہوتا ہے ۔

سبائیت و رافضیت کی جھوٹی اور من گھڑت روایات نے اتنا اندھیرا پھیلایا ہے کہ سنی بھی سُن ہو کے رہ گئے اور گذشتہ صدیوں میں جس تیزی، عیاری اور چالاکی سے شیعوں نے اپنے کافرانہ، باغیانہ عقائد پھیلائے ان کا مؤثر توڑ نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جس تاریخی کتاب کو اٹھا کر دیکھیں ۔ ذہن الجھنے اور سلگنے لگتا ہے،

ضرورت اس بات کی ہے کہ مقالہ" جاہلانہ وقاحت کی عالمانہ وضاحت" زیادہ سے زیادہ تعداد میں بصورت پمفلٹ چھاپ کر مفت تقسیم کیا جائے ۔ للہ ! آپ اس پر فی الفور عمل کریں۔

" دارِ بنی ہاشم" کے باسی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہر فتنہ کا فوری نوٹس لیا اور

" ہیرے" پتھروں سے نکال کر علیحدہ رکھ دیے۔
اس کا ثبوت حالیہ شمارے میں" دل کی بات"
میں وزیر اعلیٰ نواز شریف کے اس بیان پر بے خوف
تبصرہ کی صورت میں موجود ہے جو انہوں نے رافضیوں
کی حمایت میں دیا۔ ملک کے اور کسی رسالے نے
وزیر اعلیٰ کے اس جاہلانہ بیان کا نوٹس نہیں لیا۔

والسلام

محمد حامد سراج

(کنڈیاں شریف)

محترم!

سلام مسنون!

اس سے پیشتر کہ میں اپنے دل کی بات کہوں
آپ "دل کی بات" پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے!
نقیب ختم نبوۃ میں آپ نے "دل کی بات"
کے مستقل عنوان کے تحت جس حق گوئی و بے باکی
سے حالات کا تجزیہ کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ
ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ اللہ کرے
زور قلم اور زیادہ۔

آپ نے ہمہ جہتی مسائل پر نہ صرف ناقدانہ
اظہار خیال کیا ہے بلکہ ان کا صحیح حل بھی پیش کیا ہے!
آپ کی تحریر اس دور قحط الرجال میں صحافت کے
صنم خانے میں ایک مرد حر کی اذاں لا الہ الا اللہ
کے مترادف ہے۔ وما توفیقی الا باللہ!

ماہ جون کے شمارہ کے سرورق پر" قلندر ہر چہ
گوید دیدہ گوید" کے تحت حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ
کا ایک فرمودہ انتباہ چھپا ہے! اصل میں یہ حضرت
شاہ جیؒ کی ایک تقریر کا اقتباس ہے جو انہوں نے
۱۹۴۵ء میں چوک فرید امرتسر ہی کی تھی! ۱۹۴۷ء میں
دفتر مجلس احرار اسلام میں بھی یقیناً یہ بات فرمائی
ہوگی۔!

آج بھی وہ منظر میرے سامنے ہے! صاحبزادہ
فیض الحسن مرحوم کی صدارت میں جلسہ تھا۔ اور
صاحبزادہ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں (جو کہ
انہوں نے حضرت شاہ جیؒ سے پہلے کی تھی) یہ کہا
کہ" یہ دور مسلمانوں کے لئے انتہائی نازک دور ہے"
(وغیرہ وغیرہ) تو شاہ جیؒ نے خطبہ مسنونہ کے بعد
صاحبزادہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا

میرے بھولے شاہ جی سنو!

سقوط سپین کا ماتم ہم کر چکے ہیں اور کربلا کا دور
بھی جھیل چکے ہیں۔ ترکی اور حجاز کے ٹکڑے
ہمارے سامنے ہوئے۔ اور اب مجھے صاف
نظر آ رہا ہے، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ دور
دور تک آگ لگی ہوئی ہے مکان جل رہے ہیں
دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی ہے
باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ چاروں طرف قیامت
کا صور پھک گیا ہے۔ آج ہنستے ہو کل روؤ گے
تم نہیں دیکھ سکتے میں دیکھ رہا ہوں ہاں ہاں

میں دیکھ رہا ہوں یہ در و دیوار کی اینٹیں نہیں انسانی سروں کی کھوپڑیوں کے انبار ہیں۔ یہ سب کچھ بیتنے والا ہے ایک دبا پھوٹ چکی ایک دبا آرہی ہے۔ انسانی تہذیب غاروں اور جھونپڑوں سے شروع ہوئی تھی اور غاروں پر ہی ختم ہوگی۔ یہ ٹوڈیوں اور غداروں کا دور ہے۔

شاہ جی! آپ اس کو نازک دور کہتے ہیں جس میں انسانیت کا سودا چکایا جا رہا ہے۔ یار رکھو! جو کچھ آج بو رہے ہو کل اسے تم ہی کاٹو گے"

رات ایک بجے تک تقریر جاری رہی۔ شاہ جیؒ آنے والے کل کے حالات کا نقشہ کلہاڑی پر بنا کر سمجھاتے رہے۔ آخر یہ شعر ترنم سے پڑھا اور تقریر ختم کر دی۔ ؎

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل
بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

والسلام

شیخ عبدالمجید احرار امرتسری

گوجرانوالہ

برادرانِ محترم و مکرم

السلام علیکم! "نقیبِ ختمِ نبوت" پہلی بار ملا۔ شکریہ!

مجلّہ صوری اور معنوی اعتبار سے لائقِ صد تحسین، علمی و ادبی اعتبار سے اس کا درجہ بلند ہے یہ آپ حضرات کی محنت مقصد سے لگن اور دین کی خدمت کا مرقع ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دین کے اس چشمے کو جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حمد باری تعالیٰ ارسالِ خدمت ہے۔

ان دنوں نئی تصانیف کی تدوین و اشاعت میں منہمک ہوں۔ "معراج سفر" شائع ہو چکی ہے یہ بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ تمام مقاماتِ مقدسہ کو منظوم کیا ہے ڈاکٹر ریاض مجید کا ایک سو اشعار کا دیباچہ ہے۔

دوسری کتاب "صلِّ علی النّبی" ہے۔ یہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ اب چند دنوں تک "سبحان اللہِ وبحمدہٖ" حمدیہ مجموعہ شائع کر رہا ہوں۔ یہ دوسرا حمدیہ مجموعہ ہے، پہلا حمدیہ مجموعہ "ذوالجلال والاکرام" ہے۔ تیسرا حمدیہ مجموعہ "سبحان اللہ العظیم" بھی ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

سب کو سلام۔ اماں جی صاحبہ کی خدمت میں مؤدبانہ سلام عرض کریں۔ والسلام دعاگو حافظ لدھیانوی

۳۴ جی گلستان کالونی۔ فیصل آباد

محترم! السلام علیکم

مجھے "ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت" پڑھنے کا موقع ملا۔ خصوصاً رافضیوں اور مرزائیوں کے محاسبہ پر مشتمل تحریروں نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں رسالہ کا مستقل خریدار بننا چاہتا ہوں۔

والسلام رضوان حیدر بنگلیال دریا خان

(اشرف عطا مرحوم)

نغمے اور آنسو

ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں
ہزار بار ہوا انقلاب چرخ کہن
ہزار بار لٹیں عصمتیں غریبوں کی
ہزار بار اجاڑی گئی ہے بزم زمن
غریب و بیکس و نادار کے لہو سے ندیم
ہزار بار سنواری گئی ہے بزم چمن!
ہجوم حسرت و ارمان و آرزو توبہ
متاع خاک نشیناں ہوئے ہیں رنج و محن
ہزار بار محبت میں کھائے ہم نے فریب
ہزار بار ہوئے ہم اسیر چاہ ذقن
نگار صبح جوانی بہار روئے چمن
شمیم باد بہاری فضائے کوہ و دمن
سمجھ میں آئے نہ میرے تری خدائی میں
رموز عشق و محبت بتان غنچہ دہن
غریب کے لئے جور و ستم زمانے کے
امیر کے لئے رقص و شراب و مشک ختن

حافظ وقار احمد

سبب کیا ہے؟

لہو میں نفرتوں کا زہر تیزی سے
سرایت کرتا جاتا ہے
زباں سے حرف ناگوں کی طرح باہر نکلتے ہیں
سماعت کے ذریعے ذہن کے اندر اتر کے
سوچ کو ہر وقت ڈستے ہیں
سبب کیا ہے؟
کہ جس کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں
اس شجر کی اپنے ہاتھوں سے
جڑوں کو کھودنے میں ایسے غلطاں ہیں
کہ یہ بھی سوچنا ممکن نہیں شاید
کہ یہ سایہ سروں سے اٹھ گیا تو پھر
حوادث دھوپ کی شدت سے اور موسم کی
سختی سے
بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ممکن
تباہی کی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کے اس کا
انبوہ سے پوچھیں
سبب کیا ہے؟
مگر یہ کون پوچھے گا؟

(منظر امروہوی)

دو مونچھوں کا بوجھ

ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولے میرے مہرباں ۔ کس قدر پژمردہ دل ہیں آج کل کے نوجواں
ان کے چہرے پر نہ شوخی اور نہ سینہ میں امنگ ۔ بزدلانہ حرکتوں میں ہے زنانہ رنگ ڈھنگ
ڈھیلے ڈھالے سست بازو دُبلے پتلے ناتواں ۔ زندگی کا کچھ نظر آتا نہیں جن میں نشاں
دو قدم ہو اگر چلنا تو سواری چاہیئے ۔ ایک سگریٹ بکس لانا ہو تو لاری چاہیئے
اگلے وقتوں کے جوانوں کا تو منظر ذکر کیا ۔ بُڈھے بُڈھے پھیرتے تھے بڑھ کے کلّہ شیر کا
جاتے سو سو میل تک پیدل تھے وہ مردانہ وار ۔ جانتے تھے بزدلی جانا کہیں ہو کر سوار
فیشن ایبل وردیاں کرتے نہ تھے وہ زیبِ تن ۔ موٹے جھوٹے کپڑوں میں رکھتے تھے خاصا بانکپن
اپنے ہاتھوں دیتے تھے انجام اپنے سارے کام ۔ بوجھ عزیزوں کا اٹھا کر بنتے تھے وہ نیک نام
سُن کے میں بولا کہ صاحب! ہیں بڑی مجبوریاں ۔ بڑھ گئیں حد سے سوا ہیں آج کل کمزوریاں
کیا اٹھائیں گے وہ نازک نوجوان عزیزوں کا بوجھ ۔ اٹھ نہیں سکتا ہے جن سے اپنی دو مونچھوں کا بوجھ

دعائے صحت

- گجرات میں ہمارے رفیق جناب عبدالسمیع صاحب کی والدہ محترمہ دل کے عارضہ میں مبتلا ہیں ۔
- خان پور میں مجلس احرارِ اسلام کے رہنما جناب بدر منیر احرار کی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ صاحبہ علیل ہیں ۔
- احمد پور شرقیہ میں تحریک آزادی کے پرانے کارکن جناب قدوس انصاری علیل ہیں ۔
- مدرسہ معمورہ کے معاون حبیب الرحمٰن بٹالوی صاحب کے فرزند علیل ہیں ۔
- ادارہ نقیب ختم نبوت کے رکن ابو میسون اللہ بخش احرار کی اہلیہ علیل ہیں ۔

قارئین ان سب خواتین و حضرات کی صحت کے لئے دُعا کا اہتمام فرمائیں خصوصاً نمازوں کے اوقات میں دعاؤں میں ضرور شامل کریں ۔ علاوہ ازیں جملہ تمام بیمار مسلمان بھائیوں ، بہنوں کی صحت کی بھی دعا فرمائیں !

(ادارہ)

آئیے۔ اللہ کی رضا اور اجر حاصل کیجئے!

ہمارے دینی ادارے اور مستقبل کے منصوبے

مسلمان توجہ فرمائیں

▶ — مجلس احرار اسلام دینی انقلاب کی داعی ہے۔ دینی انقلاب — دینی مزاج اور دینی ماحول پیدا
بغیر ممکن نہیں۔ ۱۹۲۹ء سے آج تک احرار نے بیسیوں تحریکوں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ احرار کی سب سے
ں، مضبوط اور زندہ تحریک **تحریکِ ختمِ نبوّت** ہے۔

▶ — پاکستان سے پہلے اور پاکستان کے بعد احرار نے سینکڑوں دینی ادارے قائم کیے جن سے اُمّتِ مسلمہ میں دینی مزاج
اور دینی قوتوں میں اضافہ ہوا۔ اکابرِ احرار نے ایک بات شدت سے محسوس کی کہ جب تک دینی ادارے بُنیادی طور پر احرار کی
نی میں نہیں چلتے اُس وقت تک یکجہتی پیدا ہونا مشکل امر ہے۔ لہٰذا ہم نے اُمّتِ مسلمہ کے تعاون سے اندرون و بیرونِ ملک دینی ادارے
کئے ہوئے ہیں جن کی مختصر تفصیل یوں ہے:

مدرسہ معمورہ ——— مسجدِ نور، تغلق روڈ ملتان ———
مدرسہ معمورہ ——— دارِ بنی ہاشم، پولیس لائنز روڈ ملتان فون ۴۲۸۱۳
مدرسہ محمودیہ معمورہ ——— ناگڑیاں ضلع گجرات ———
جامعہ ختمِ نبوّت ——— مسجد احرار متصل ڈگری کالج ربوہ۔ فون نمبر: ۸۸۶ ———
مدرسہ ختمِ نبوّت ——— سرگودھا روڈ ربوہ ———
دارالعلوم ختمِ نبوّت ——— چیچہ وطنی۔ فون نمبر: ۲۹۵۳ ——— ۲۱۱۲
مدرسہ ابوبکر صدّیق ——— تلہ گنگ ضلع چکوال ———
یُوکے ختمِ نبوّت مشن ——— (ہیڈ آفس) گلاسگو برطانیہ ———

یہ سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کے اخراجات اور آئندہ کے منصوبے، مسجد احرار ملتان، مدرسہ معمورہ کے بڑھتے ہوئے کام کے پیشِ نظر
اُجرائیہ اور تعمیرِ نو۔ دفاتر کا قیام، بیرونی ممالک میں مبلّغین کی تعیناتی اور اداروں کا قیام، پچاس کتابوں کی اشاعت — یہ تمام کام
علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعاون سے ہوگا۔ یہ کام آپ ہی نے کرنا ہے۔

اور آپ کریں دُعاء ہم کریں گے اور اجر اللہ پاک دیں گے — آئیے۔ آگے بڑھیے اور اَجر کمائیے

سیّد عطاء المحسن بخاری
مدیر مدارس التحفیظ والمساجد
دارِ بنی ہاشم ○ پولیس لائنز روڈ ○ ملتان
ترسیلِ زر کے لئے: اکاؤنٹ نمبر: ۲۹۹۳۲ حبیب بنک لمیٹڈ حسین آگاہی ملتان

Monthly
Phone : 72813
NAQEEB-E-KHATM-E-NUBUWWAT
Regd. L. No. 8755
MULTAN
Vol. 1
No. 8

زیرِ تعمیر:

فون: ۷۲۸۱۳

جامع مسجد ختمِ نبوّت

دارِ بنی ہاشم — مہربان کالونی — ملتان

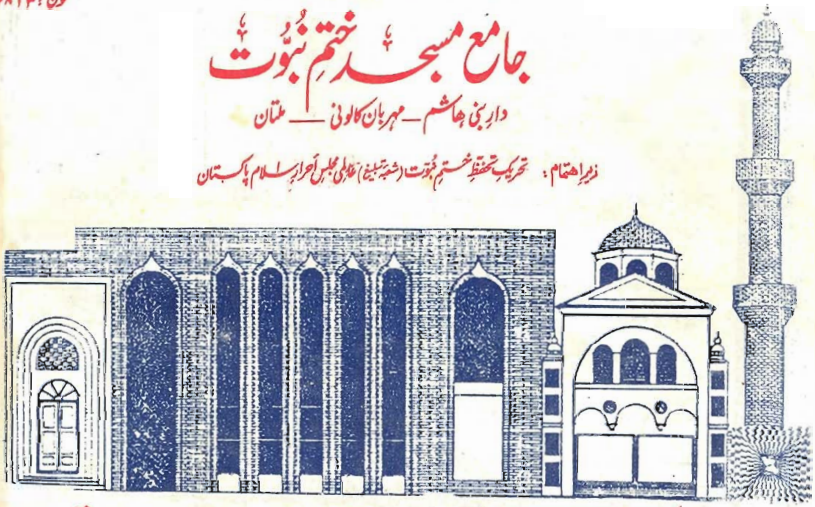

زیرِ اہتمام: تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت (شعبہ تبلیغ) عالمی مجلس احرارِ اسلام پاکستان

مسجد کی بنیادیں مکمل ہو چکی ہیں، تعمیر کی تکمیل میں بھرپور حصہ لیں، نقد و سامانِ تعمیر

دونوں صورتوں میں تعاون فرمائیں — ترسیلِ زر کیلئے:

منتظم و متولّی ابنِ امیرِ شریعت سیّد عطاء المحسن بخاری، دارِ بنی ہاشم — ملتان

اکاؤنٹ نمبر: ۲۹۹۳۲، حبیب بنک حسین آگاہی ملتان